داستان میری ذکر تیرا

افسانے

داستان میری ذکر تیرا

افسانے

مہندر ناتھ

ایشیا پبلیشر
اے 36 - چینک اپارٹمنٹس، پلاٹ نمبر 27/2
سیکٹر 9 - روہنی - نئی دہلی 85

نام کتاب ——— داستان میری ذکر تیرا

مصنّف ——— مہندر ناتھ

کتابت ——— محمد عارف سہسوانی

اشاعت ——— سنہ ۲۰۰۰ء

قیمت ——— ۱۲۵ روپے

مطبع ——— فوٹو آفسیٹ پرنٹرس دہلی

DASTAN MERI ZIKAR TERA

by

Mahinder Nath

Rs. 125/-

انتساب

جناب اندر کمار گجرال کے نام

مہندر ناتھ

ترتیب

سُورج ڈھلنے سے پہلے

جب گلنار اسٹیشن پہنچی تو سہیلیوں نے اسے گھیر لیا۔

اتنی دیر لگادی "؟ ایک بولی۔

دوسری نے گلنار کے بالوں کو دیکھ کر کہا ـــــ " بس قیامت ڈھا رہی ہو اس وقت !"

انگور بالا تو اسے گھسیٹتی ہوئی ایک طرف لے گئی اور بڑے رازدارانہ انداز میں بولی۔ "خدا تمھیں کامیابی عطا کرے، اور تیر اندازی ٹرافی لے کر واپس آئے یہی میری دُعا ہے۔ ایک عرض کرنا چاہتی ہوں ! "

" جلدی بتا۔ گاڑی چھوٹنے والی ہے ! گلنار نے بالوں کی ایک لٹ کو پیشانی پر جماتے ہوئے کہا۔

" ذرا اس سے بچ کر رہنا۔"

"کس سے بی بی ؟ "

" اس شیطان نثار سے ! "

"کون نثار ؟ "

"کان پور میں ایک ہی تو آدمی ہے، جو ہر لڑکی پر جان نثار کرتا ہے، بس ذرا اس سے —"

"تمھیں کیسے معلوم ہے؟"

"دو سال ہوئے ٹروپ لے کر گئی تھی کان پور!"

"اوہ! یعنی ذاتی تجربہ ہے۔"

"کچھ سمجھ لو!"

"کیا کرتے ہیں یہ صاحب؟"

"اچھے خاصے ڈرامہ ڈائرکٹر ہیں۔ بڑے جہاندیدہ، چالاک عیار اور چرب زبان ہیں۔ ڈرامہ ڈائرکٹ کرتے کرتے جس لڑکی پر ان کا دل آجائے اسے اپنے دام فریب میں پھانس لینا ان کے بائیں ہاتھ کا کرتب ہے۔ اس لئے آگاہ کئے دیتی ہوں کہ۔"

"تم مجھے دودھ پیتی بچی سمجھتی ہو انگور!"

"لاابالی سی لڑکی ہو، اس لئے وارننگ دے رہی ہوں!"

"لڑکی!" گلنار نے ہنستے ہوئے کہا۔ "میں فل بلڈڈ عورت ہوں، عورت! کسی کے جھانسے میں آنے والی نہیں! اپنے الفاظ واپس لو!"

"یوں میں نے پُشپا کو بھی سمجھا دیا ہے، وہ بھی تیرا خیال رکھے گی۔ پھر بھی اپنی حفاظت تمھیں خود کرنی پڑے گی۔ تم بہت جلدی —" یہ کہہ کر انگور بالا چپ ہو گئی۔

"اچھا ڈیر ممی! اب اجازت دو۔ سگنل ہو گیا۔ یہ کہہ کر گلنار ڈبے کی طرف دوڑی۔ داخل ہوتے ہی سب لڑکیاں اس پر برس پڑیں۔

"بہت راز و نیاز کی باتیں ہو رہی تھیں انگور سے" ایک نے چمک کر کہا۔

"انگور کو تو کسی اسکول میں استانی ہونا چاہیئے۔ نہ جانے کیسے یہ آرٹسٹ بن گئی۔ ملتے ہی نصیحتوں کا ایک دفتر کھول دیا۔ کان پور جا کر یہ نہ کرنا، وہ نہ کرنا!"

یعنی اماں کا رول ادا کر رہی تھیں۔" اروںا نے آنکھیں مٹکاتے ہوئے کہا۔

"بالکل ٹھیک" گلنار نے سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

دورانِ سفر میں گلنار بالکل خاموش رہی۔ دل ہی دل میں سوچتی رہی، کیا میں اتنی بدھو ہوں کہ ہر شخص مجھے مشورہ دیتا ہے۔ فلاں سے بچ کر رہنا۔۔۔ اونہوں۔ اتنی بڑی ہو گئی ہوں پھر بھی جان پہچان والوں کو مجھ پر بھروسہ نہیں۔ بھلا نثار سے میرا کیا تعلق۔ ہوگا کوئی۔ مجھے اس سے کیا غرض؟ اول تو میں اسے جانتی ہی نہیں۔ صورت شکل سے ناآشنا ہوں۔ کسی نے تعارف کرا دیا تو کیا وہ مجھے کھا جائے گا! کوئی تیس مار خاں ہے وہ کہ دیکھتے ہی اس پر فریفتہ ہو جاؤں گی۔ اور پھر کوئی میں ماہ لقا ہوں کہ دیکھتے ہی مجھ پر ریجھ جائیگا۔ بڑی مشکل سے تو میری ان سے جان چھوٹی ہے، اب میں کسی اور کے جانسے میں آنے والی نہیں۔

کان پور اسٹیشن پر کافی لوگ استقبال کے لئے آئے۔ چند منچلے نوجوان بھی تھے، جو بمبئی سے آنے والے ٹروپ کو دیکھنے آئے تھے۔ بہت گھور گھور کر دیکھتے رہے، پھر اپنا سا مُنہ لے کر چلے گئے۔ گلنار اور اس کے ٹروپ کو ایک اچھے ہوٹل میں ٹھہرایا گیا۔ رات کو ڈرامہ اسٹیج کرنا تھا۔ گلنار اپنے ٹروپ کی انچارج تھی۔ خود اسٹیج پر بحیثیت ایک ایکٹرس کے کام کرتی اور پورے ٹروپ کی دیکھ بھال بھی اسی کے سپرد تھی۔ ڈرامہ شروع ہونے سے پہلے گلنار اپنے ٹروپ سمیت پہنچ گئی۔ وہاں جا کر معلوم ہوا کہ بجلی فیل ہو گئی ہے۔ دوڑتی ہوئی اسٹیج پر گئی۔ لائٹ مین ٹارچ لے کر لائٹ ٹھیک کر رہا تھا۔

"اے لائٹ مین! بجلی کب تک ٹھیک ہوگی؟"

لائٹ مین کچھ نہ بولا۔ سوئچ ٹھیک کرتا رہا۔

"کیا بہرے ہو؟ میں پوچھ رہی ہوں۔ بجلی کب تک ٹھیک ہوگی۔" گلنار نے

چیخ کر کہا۔

"جب سوئچ (switch) ٹھیک ہو جائے گا۔" لائٹ مین نے اپنا کام کرتے ہوئے جواب دیا۔

"سوئچ کب ٹھیک ہوگا؟"

"جب لائٹ آئے گی۔"

"عجیب گھن چکّر ہو تم۔ اُلٹے سیدھے جواب دے رہے ہو؟ دس پندرہ منٹ میں لائٹ نہ آئی تو ہم خاک ریہرسل کریں گے۔ بغیر لائٹ کے ڈرامہ بھی کیا ہوگا۔ گلنار نے اپنی زبان کو قینچی کی طرح چلاتے ہوئے کہا۔

لائٹ مین اپنا کام کرتا رہا، اس نے مُڑ کر بھی نہ دیکھا۔

"خر دماغ ہے یہ لائٹ مین! غصّے سے گُلنار کا چہرہ انار کی طرح سُرخ ہو گیا۔

"اگر تُم سے لائٹ درست نہیں ہوتی تو کسی دوسرے آدمی کو بلوا لو۔" گُلنار چیخ کر بولی۔

اتنے میں اسٹیج بجلی سے جگمگا اُٹھا۔ "محترمہ چلائیے نہیں، لیجئے میں نے آپ کا کام کر دیا۔" لائٹ مین نے مُڑ کر کہا۔ ایک خوش شکل اور باوقار انسان گُلنار کے سامنے کھڑا تھا۔

"تُم لائٹ مین نظر نہیں آتے!"

"خاکسار کو نثار کہتے ہیں۔"

"میں آپ کو نہیں جانتی۔"

"کوئی بات نہیں محترمہ! سارا کان پور جانتا ہے اور خاص کر وہ لوگ جنھیں ڈراموں سے ذرا دلچسپی ہے، مجھے اچھّی طرح جانتے ہیں۔ میں آپ سے ملنا چاہتا تھا محترمہ! لیکن ایک ضروری کام کی وجہ سے اسٹیشن پر نہ جا سکا۔ آپ کی ایکٹنگ کی تعریف سُن چکا ہوں۔ آج آپ کی ایکٹنگ دیکھنے کا موقع ملے گا۔ آپ جب خفا ہو جاتی ہیں تو کافی

بدصورت ہو جاتی ہیں ۔"

"اتنا بے تکلّف ہونے کی ضرورت نہیں ۔"

"میں بحیثیت ایک ڈائرکٹر کے آپ کو سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں، ورنہ مجھے کیا ضرورت ہے کہ میں آپ کو مشورہ دوں ۔ یوں اپنا چہرہ بگاڑنے کا پورا حق حاصل ہے ۔" یہ کہہ کر نثار آگے بڑھ گیا ۔

"اچھا تو یہ ہیں نثار صاحب ۔ کان پور کے مشہور ڈرامہ ڈائرکٹر! آرٹ اور ادب کے شیدائی ۔ جنھیں ڈراموں کو ڈائرکٹ کرنے میں کافی مہارت ہے ۔ یوں دیکھنے میں بُرے نہ تھے ۔ درمیانہ قد، شکل وصورت، گوارا، جسم گٹھا ہوا، اور فربہ سا ۔ آواز میں تیزی اور تندی تھی ۔ کافی مُنہ پھٹ اور بے باک نظر آتے ہیں ۔ اپنے آپ کو بہت کچھ سمجھتے ہیں ۔" یہ سوچ کر وہ اپنے ٹروپ کی طرف گئی ۔

ڈرامہ اسٹیج کیا گیا ۔ لوگوں نے کافی پسند کیا ۔ گُلنار نے اپنے رول میں جان ڈال دی ۔ چاروں طرف سے واہ واہ کے نعرے بلند ہوئے ۔ ڈرامے کے اختتام پر لوگوں نے کام کرنے والے لڑکے لڑکیوں کو ہار پہنائے ۔ تقریریں کیں، اور گُلنار کے آرٹ کو سراہا گیا ۔ اسٹیج پر نوجوانوں اور طلبا نے انھیں گھیر لیا اور آٹو گراف لئے جب سب لوگ باہر آئے تو نثار آگے بڑھا ۔

"مان گیا محترمہ! سکّہ جما دیا آپ کے ٹروپ نے!"

"شکریہ!" گُلنار نے خوش ہو کر کہا ۔

"مجھے اُمید نہیں تھی کہ آپ اتنی جلدی کامیابی کے جھنڈے گاڑ دیں گی ۔ آپ نے اپنے رول میں واقعی ایک رُوح پھونک دی ۔ ہم مُرید ہو گئے آپ کے ۔ چلئے آپ کو یہ چھوٹا سا شہر دکھا دیں ۔"

سب لڑکے لڑکیوں نے نثار کی طرف دیکھا۔ بھلا اس سے بہتر اور کیا آفر ہو سکتی ہے۔

"کسی شاندار ہوٹل میں کھانا بھی کھلاؤں گا۔" نثار نے گلنار کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

گلنار نے سوچا گھومنے پھرنے میں کیا حرج ہے۔ آج تو فتح کا پرچم بلند کیا ہے اس کی خوشی میں کان پور کی سیر کی جائے۔ "چلئے نثار صاحب! کہاں ہے موٹر آپ کی؟"

"وہ سامنے"! نثار نے اشارہ کرتے ہوئے کہا

"کان پور کی سب سے مشہور چیز کیا ہے نثار صاحب؟"

"جوتے محترمہ! جب آپ یہاں سے رخصت ہوں گی تو ایک عدد ضرور آپ کو پیش کروں گا۔"

سب لڑکیاں ہنس پڑیں، گلنار کھسیانی سی ہوگئی۔

موٹر بڑی تھی لڑکے اور لڑکیوں کی تعداد بھی کم نہ تھی۔ بس جوں توں کر کے سب بیٹھ گئے۔ چھوٹا سا شہر تھا۔ ایک آدھ گھنٹے میں سب کچھ دیکھ لیا۔ نثار نے ایک ہوٹل میں سب کو کھانا کھلایا۔ آخر میں جس جگہ ٹروپ ٹھہرا ہوا تھا پہنچا دیا۔ گلنار کو خدا حافظ کہا۔ اور ساتھ ہی یہ بھی کہا "صبح حاضر ہوں گا۔"

جب گلنار اپنے بستر پر لیٹی تو وہ اپنی کامیابی پر نازاں تھی۔ اس وقت اسے اپنی خامیوں کا بھی خیال آیا۔ ہر شخص اس کی ذہانت اور ذکاوت سے مرعوب تھا۔ اس کی ایکٹنگ کی تعریف کرتا تھا۔ بس مار کھائی تھی تو اپنی شکل وصورت سے، یوں کچھ بری نہ تھی۔ بلکہ اچھی خاصی تھی۔ چہرہ مردانہ تھا۔ چال ڈھال میں نسانیت نام کو نہ تھی۔ وہ دوسری لڑکیوں کی طرح نازک اندام نہ تھی۔ شرم سے آنکھیں جھکا لینا، زیرِ لب مسکرانا، بات بات پر آنسو بہانا اسے نہ آتا۔ اس موئے چہرے کو کیا کروں۔ پلاسٹک سرجری کرا کے اس چہرے کو ٹھیک

کرالوں، ورنہ کس بات کی کمی تھی۔ جب گلنار باتیں کرتی تو قینچی کی طرح زبان چلتی۔ کچھ لوگ تو اس کی چرب زبانی کی تعریف کرتے، کچھ برا بھلا کہتے۔ نہ جانے والدین نے اس کا نام گلنار کیوں رکھ دیا۔ نہ گل سے اس کی صورت ملتی تھی نہ انار سے!

جب گلنار اٹھی تو آنکھیں بھاری تھیں۔ رات کو اچھی طرح نیند نہ آئی تھی۔ دس بجے کے قریب نثار صاحب آ گئے۔ وقت کے بہت پابند نکلے۔ پھر پورے ٹروپ کو سیر کرانے لے گئے۔ اچھے ہوٹل میں پھر کھانا کھلایا اور واپس ہوٹل بھی پہنچا دیا۔ تین دن تک گلنار کا ٹروپ اس شہر میں رہا اور تین شو دیئے۔ بزنس کے لحاظ سے شو کامیاب رہے لوگوں نے تعریف کے پل باندھ دیئے اور نثار تو گلنار کی تعریف کرتے کرتے زمین اور آسمان کے قلابے ملاتا رہا۔ گلنار کے فن کو سراہتا رہا۔ ایک دو بار یہ بھی کہا:۔

کیا قیامت کی نظر پائی ہے آپ نے! کاش آپ کے چہرے کے نقوش ذرا موزوں ہوتے تو خدا کی قسم! قیامت برپا کر دیتیں آپ قیامت!"

انھیں چھوڑنے کے لئے وہ اسٹیشن پر آیا۔ الوداع کہنے سے پہلے اس نے گلنار سے کہا "کبھی بمبئی آیا تو آپ کی زیارت کروں گا!"

گلنار خاموش رہی اور ڈبے میں بیٹھ گئی۔

گاڑی چھوٹنے سے پہلے ایک ہاتھ کھڑکی کی طرف بڑھایا۔

"لیجیے، کان پور کی سوغات!" نثار نے ایک پیکٹ دیتے ہوئے کہا۔

"کیا ہے اس میں؟" گلنار نے خوش ہو کے پوچھا۔

"چپّل محترمہ!"

"پاؤں میں فٹ آئے گی نثار صاحب! یا صرف مارنے کے لئے استعمال کی جائے گی؟"، گلنار نے چڑ کر کہا۔

"آج تک ہمارا اندازہ کبھی غلط نہیں نکلا۔ پہلے پہن کر دیکھئے۔ اگر فٹ آئے تو پھر اس سے دوسرا کام لیجئے گا۔" نثار نے مسکراتے ہوئے کہا

بمبئی پہنچ کر انگور بالا سے ملاقات ہوئی۔ گلنار نے اسے جھاڑ دیا۔

"عجیب عورت ہو، اچھے خاصے آدمی کو ناحق بدنام کر رہی ہو۔ اتنا باوقار اور بااخلاق انسان میں نے کہیں نہیں۔ ہماری اچھی خاصی آؤ بھگت کی۔ سب کو سارے شہر کی سیر کرائی، لذیذ کھانے کھلائے اور اسٹیشن پر الوداع کہنے کے لئے آیا، اور کیا کرتا بچارا؟"

"پھر بھی کہہ رہی ہوں بچ کے رہنا!" انگور بالا نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

گلنار کو نصیحتوں اور مشوروں سے سخت چڑ تھی۔ جس کام کے لئے اس کی سہیلیاں منع کرتیں، وہ ضرور کرتی۔ ایک تو جان ہے اسے بھی زنجیروں میں جکڑ دیا جائے۔ قدم پھونک پھونک کر رکھو، یہ نہ کرو، وہ نہ کرو۔ تو کرو کیا؟ بھلا نثار نے میرا کیا بگاڑا ہے؟ اس نے میرے ساتھ کیا زیادتی کی جو اسے کوستی پھروں یا اس سے ڈروں، اس سے دور رہوں، ڈاکٹر ہونے کے علاوہ قبول صورت بھی، صحت اچھی خاصی ہے۔ بس ذرا چرب زبان ہے۔ وہ تو میں بھی ہوں ـــــ اسی طرح سوچتے سوچتے کئی دن بیت گئے۔

اچانک ایک دن نثار کا خط آگیا۔ پڑھا تو جی خوش ہو گیا۔ ہائے کتنی تعریف کی تھی اس نے میری! لوگ تو کسی کی تعریف بھی نہیں کرتے۔ تعریفی جملوں کو یوں سنبھال کر رکھتے ہیں، جیسے سونے یا چاندی کی اینٹیں! وہ جواب دینا ہی چاہتی تھی کہ دوسرا خط آگیا اور پھر خطوں کا ایک تانتا بندھ گیا۔ خط اتنے بڑے نہیں لکھتا۔ گلنار کی خوش مزاجی

اور فراخ دلی کی تعریف کرنا۔ چلتے چلاتے گلنار کی فگر کے بارے میں دو جملے لکھ دیتا۔ ایک خط تو کُھل کر ہی لکھ دیا ــــــ

"اگر ہم دونوں ڈرامہ اسٹیج کریں، تو انشاء اللہ سارے بھارت پر چھا جائیں۔ سوچو تو۔ ہمارے پاس سب کچھ ہے۔ ہیرو، ہیروئن موجود۔ یعنی میں اور تم۔ ڈرامہ ڈائرکٹ میں کروں گا۔ سارے ٹروپ کو تم سنبھال لوگی!"

اسکیم بُری نہ تھی۔ بھلا روپوں کی کسے ضرورت نہیں، ایک اچھا خاصا ڈرامہ ٹروپ بن سکتا ہے۔ اس کے بعد روپوں کی بارش ہوگی، اور باقی ماندہ زندگی آرام سے گزر جائے گی گلنار۔"

اگلے خط میں نثار نے بمبئی آنے کے لئے لکھا۔ گلنار انکار نہ کر سکی۔ نثار کو اپنے گھر ٹھہرا لیا۔ دو کمروں کا فلیٹ تھا۔ اَمّی جان سے ملوایا۔ دوستوں اور واقف کاروں سے تعارف کرایا۔ نثار کے آرٹ اور فن کی تعریف کی۔ سہیلیوں نے دیکھا۔ انگور بالا نے دیکھتے ہی کہا:۔

"جس بات کے لئے منع کیا تھا، وہی کیا تُم نے؟ بڑی نالائق ہو گُلنار!"

"تم نے لائق بن کر کیا کر لیا انگور! تیری زندگی اتنی ویران، اور بنجر ہے کہ کوئی لنگور بھی اس میں جھانک کر نہیں دیکھتا۔ زیادہ باتیں مجھ سے نہ کہلوا۔ جو کچھ ہو رہا ہے ہونے دے۔"

اس دن کے بعد انگور نے چُپ سادھ لی اور اس موضوع پر کبھی بات نہ کی۔

نثار صرف چند دنوں کے لئے بمبئی آیا تھا۔ لیکن یہاں دو ماہ ٹھہرا۔ گلنار نے خوب آؤ بھگت کی۔ لذیذ اور خوش ذائقہ کھانے کھلائے۔ پُورے بمبئی کی سیر کرائی۔ اپنے

دوستوں سے ملایا۔ بڑھا چڑھا کر نثار کی تعریف کی۔ گلنار کا اچھا خاصہ رسوخ تھا۔ جان پہچان والے معمولی آدمی نہ تھے۔ اچھی خاصی پوزیشن کے مالک تھے۔ سب نے دونوں کو گھر پر بُلا کر چائے پلائی۔ کسی نے کھانے کی دعوت دی۔ کسی نے شراب پلائی۔ نثار تو بری طرح فریفتہ ہو گیا گلنار پر!

گلنار میں زنانہ پن نہ تھا۔ بڑے کھلے دل کی عورت تھی، جسے چاہنے لگتی، تو بس بغیر سوچے سمجھے فریفتہ ہو جاتی اور پھر دل و جان سے اس کی خدمت کرتی۔ اس نے اپنی ذات کو اس کی خدمت سے کبھی الگ نہ کیا۔ یہ سب کچھ تیرا ہے۔ گھر بار، میرے دوست یار، میری کمائی، میرا وجود۔ سب کچھ تیرا ہے۔ تم ہی اس کے مالک ہو۔ محبت کی وادی میں کیا قدم رکھا کہ چاروں طرف جذبات اور احساسات کی شمعیں روشن ہو گئیں۔ قصہ مختصر اس عاشق جانباز کو ساتھ لئے ہوئے صحرا صحرا اور جنگل جنگل گھومی۔ تھوڑے عرصے میں ایک ڈرامہ یونٹ تیار کر لیا اور کئی شہروں کے چکر لگائے۔ گلنار اور نثار کی جوڑی کافی مشہور ہو گئی۔ دورانِ سفر میں محبت اپنے عروج پر پہنچی۔ اور جب محبت کی شام کا آغاز ہونے لگا تو گلنار کے پاس جاں نثار کے وعدوں کے سوا کچھ نہ تھا۔

وہ انہی وعدوں کو سینے سے لگائے واپس بمبئی پہنچی۔ اس عرصے میں گلنا کو اس بات کا پتہ چل گیا کہ نثار شادی شدہ ہے اور چار بچوں کا باپ بھی ہے — جو ہونا تھا ہو چکا۔ زہر کھانا تھا، کھا لیا۔ اب پچھتانے سے کیا فائدہ؟ — انہی وعدوں کی سیج بچھائے ہوئے وہ نثار کا انتظار کرنے لگی۔ تین ماہ بعد نثار کا تار آیا کہ آ رہا ہوں۔ معیّنہ تاریخ پر نثار آیا۔ گلنار کے گھر ٹھہرا۔ اب کے نثار کے تیور بدلے ہوئے تھے۔ محبت کا روشن دور ختم ہو چکا تھا اب نہ نگاہوں میں چمک تھی، نہ آواز میں نرمی، اور نہ باتوں میں رس ہی۔ بہت کڑوی کسیلی باتیں کرتا۔ گلنار تو سب کچھ پہلے ہی نثار کر چکی تھی۔ اب اس کے پاس خلوص و خدمت کے سوا کچھ نہ تھا۔ نثار اس کی کمزوریوں سے آگاہ تھا، وہ گفتار کا غازی، اس لئے گلنار

کو چکنی چپڑی باتوں کے گھیرے میں گھیر لیا۔ گلنار عورت ہی تھی نا، مرد کا سہارا نہ لیتی تو کیا کرتی؟ اس نے گلنار کو سمجھا کر چپ کر دیا کہ وہ دوسری شادی بھی کر سکتا ہے، ہم سب اکٹھے رہیں گے اور بمبئی میں ایک خوشگوار زندگی کا آغاز کریں گے۔" سچ کہتا ہو گلنار! جب میں یہاں رہتا ہوں تو میرا دھیان بیوی اور بچوں میں رہتا ہے، اور جب میں کانپور میں رہتا ہوں تو میرے خیالوں کی دُنیا تم رہتی ہو۔ کوئی ڈھنگ کا تخلیقی کام نہیں ہو سکتا۔ اگر اجازت دو تو اپنی بیوی و بچوں کو بلوا لوں، ہم سب امن اور چین کی زندگی بسر کریں گے۔"

گلنار ہارے ہوئے جواری کی طرح نثار کی باتوں میں آگئی۔ ہاں کر لے گا شادی۔ ایک داؤں اور سہی۔ شاید زندگی کا رُخ بدل جائے۔ اس عمر میں اب اسے کون سنبھالے گا۔ اب اس ویران چہرے کی طرف کون دیکھے گا۔ گلنار نے ہاں کر دی۔

نثار کے بیوی بچے آگئے۔

بڑی کڑی آزمائش تھی۔ گلنار نے اپنی اَنا کو مار کر محبت، اپنا سارا خلوص اس کے کُنبے پر نچھاور کر دیا۔ ایک نوکرانی کی طرح ان سب کی خدمت کرتی رہی۔ صرف خدمت ہی نہیں، اس پورے کنبے کی پرورش کرتی رہی۔ مکان کے کرائے اور راشن کے لئے گلنار ہی کو دوڑ دھوپ کرنی پڑتی۔ فلم میں چھوٹے چھوٹے رول کرتی، ڈراموں میں پارٹ کرتی۔ ڈبنگ میں حصہ لیتی، ریڈیائی ڈراموں میں پارٹ کرتی، اور اس طرح جو کچھ ملتا گھر میں لاتی۔ یہ دونوں میاں بیوی گھر میں پڑے رہتے اور مزے سے کھاتے۔ شام ہوتی تو بن سنور کر باہر چلے جاتے۔ کئی بار تو گلنار سہیلیوں سے روپے ادھار مانگ کر راشن لائی۔ نثار کے بچوں کو نہلایا دُھلایا، کپڑے پہنائے، کنگھی چوٹی کی، اُن کے کپڑے دھوئے۔ کیا کچھ نہیں کیا۔ نثار کے بچوں کے لیے۔ لیکن نثار بڑا ہی احسان فراموش نکلا۔ گلنار کو محض ایک نوکرانی بنا کر رکھ دیا۔ ماں اور بیٹی دونوں کو کھانا تیار کرنا پڑتا اور یہ دونوں مزے سے لیٹے رہتے۔ جب سے نثار کی بیوی آئی تھی

گلنار محبّت کے دو بول سُننے کے لیے ترس گئی تھی۔ اب تو نثار اس کے ساتھ باہر جاتا، نہ گلنار کے ساتھ کھانا کھاتا۔ بات کرنا تک گوارا نہ کرتا، بلکہ اپنی ہتک سمجھتا تھا۔ گلنار سب کچھ دیکھ رہی تھی اور دل ہی دل میں آگ بگولا ہو رہی تھی۔

ایک دن جب نثار کی بیوی اور بچّے کسی سے ملنے گئے، گلنار بن ٹھن کر نثار کے کمرے میں داخل ہوئی۔ نثار نے دیکھا تو ماتھے پر بل پڑ گئے۔

"کیا ہوا گلنار؟ چہرے پر لعنت برس رہی ہے!" نثار نے بہت تلخ لہجے میں کہا۔

گلنار کو یہ جملہ تیر کی طرح لگا۔ وہ بچاری اس لیے کمرے میں آئی تھی کہ نثار پیار کے دو جملے کہے گا۔ کتنی محبت سے اس نے جوڑا بنایا تھا۔ صُورت کی بات کرتا ہے، سیرت نہیں دیکھتا۔

گلنار اس کی میز پر بیٹھ گئی اور اپنی نئی ساڑی کی طرف دیکھنے لگی!

"چھی چھی! بہت چیپ ٹیسٹ ہے تیرا۔ خیر! تو ذرا اس کرسی پر بیٹھ جا، میری بیوی آ رہی ہوگی۔ دیکھ لے گی تو۔۔۔" اس نے ٹانگیں سکیڑتے ہوئے کہا۔ یہ فقرہ سنتے ہی گلنار کے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔ اس نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ لیکن اس وقت ہر کوشش رایگاں گئی۔ جو لاوا سینے کے اندر بند تھا اس وقت پھٹ پڑا۔

"میں کرسی پر بیٹھنے سے پہلے تم سے یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ میں تمھاری کیا لگتی ہوں؟"

"میں تو احتیاطاً تم سے کہہ رہا ہوں۔ یوں تو تم بھی میری بیوی ہو۔" نثار نے پینترا بدلتے ہوئے کہا۔

"کیا تم یہی الفاظ اپنی بیوی کے سامنے کہہ سکتے ہو کہ میں تمھاری بیوی ہوں؟"

"جب وقت آئے گا ضرور کہوں گا۔"

"کب وقت آئے گا؟" گلنار نے اس سے جھنجھلاتے ہوئے کہا۔

"خفا نہ ہو، آؤ میرے پاس!"، جب گلنار اس کے قریب نہ آئی تو نثار نے اس کے قریب آنے کے لئے قدم بڑھایا۔

"وہیں کھڑے رہو! میرے قریب نہ آنا۔ آج میں نے تمھارا اصلی روپ دیکھ لیا ہے۔ تم مجھ سے شادی کرنا نہیں چاہتے۔ شاید یہ رشتہ بھی منظور کر لیتی لیکن مجھے اس بات کا احساس ہو گیا ہے کہ تم مجھے انسان نہیں سمجھتے۔ تم مجھے اپنی نوکرانی بنا کر اس گھر میں رکھنا چاہتے ہو، تاکہ میں تمھارے کنبے کو پالتی رہوں۔ یہ گھر میرا ہے، تمھارا نہیں۔ تم مجھے نفرت اور حقارت سے دیکھو اور میرے مال پر عیش کرو۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ تم مجھے دو کوڑی کی عورت سمجھو، اور اپنے آپ کو اعلیٰ خاندان کا چشم و چراغ! میری کمائی پر زندہ رہو اور مجھی کو حقیر سمجھو۔ اب میں تمھاری باتوں میں نہ آؤں گی۔ کبھی نہ آؤں گی۔ یہ کہتے کہتے گلنار کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور آواز بھر آگئی۔

یہ کیا کہہ رہی ہو گلنار؟ مجھے غلط سمجھ رہی ہو۔ میں تم سے پیار ــــ"

"نثار، یہ اسٹیج نہیں ہے۔ گھر کی چار دیواری ہے۔ نو ایکٹنگ پلیز ــ!"

"سمجھنے کی کوشش تو کرو ڈیر گلنار!"

"اب میں نے ٹھیک سمجھا ہے تمھیں۔ تمھارا اصلی چہرہ دیکھ لیا۔ اس خوبصورت چہرے کے پیچھے بہت بدصورت چہرہ چھپا ہوا ہے۔ جو بار بار یہی کہتا ہے۔ مجھے تم پر اعتبار نہ کرنا چاہیئے۔ ہرگز نہ کرنا چاہیئے!!"

"اس وقت تو جاؤ ڈیر! میری بیوی آجائے گی اور سارا معاملہ بگڑ جائے گا۔

"تم اپنی بیوی سے بہت ڈرتے ہو۔ اسے معلوم ہو جائے گا تو نہ جانے کیا قیامت آجائے گی۔ میرا تمھیں ذرا بھی خیال نہیں۔ خیر جو بات اس وقت کہوں گی چلا کر نہ کہوں گی۔ بہت پیار اور ادب سے کہنا چاہتی ہوں کہ تم سورج ڈھلنے سے پہلے اپنی

پیاری بیوی، اور اپنے پیارے بچوں کو لے کر، اس فلیٹ سے نکل جاؤ۔ ورنہ۔"

"کیا کروگی گلنار!"، نثار نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

"پولیس کو بلواؤں گی ڈیر! میرے جانِ نثار! دھکے دے کر اس گھر سے باہر نکلوادوں گی! آپ کی خیریت اِسی میں ہے کہ پولیس بلوانے کی نوبت نہ آئے۔ سمجھے ڈیر!"

یہ کہہ کر گلنار اپنے کمرے میں چلی گئی، اور پلنگ پر گرتے ہی زاروقطار رونے لگی!!

دیوی

مہنت کمار اپنے ڈرائنگ روم میں بیٹھا ناشتہ کر رہا تھا کہ اچانک کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔

"پھر آگیا کوئی مانگنے والا!" وہ بڑبڑایا!

غصے میں آکر اس نے دروازہ کھولا۔ سامنے راجو کھڑا تھا۔

"ارے راجو! ۔ تم ۔ تیس برسوں کے بعد آج مل رہے ہو؟"

دونوں دوست بغل گیر ہوئے ۔ خوشی سے ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

"کیا کرتے رہے اتنے عرصے راجو۔

"جو ہر آدمی کرتا ہے مہنتو!"

"تم نے مہنتو کہہ کر میرے بچپن کی یاد تازہ کر دی ۔ بتا تو سہی زندگی کیسے گزاری؟"

"عزیز دوست! جوان ہوتے ہی والدین نے شادی کر دی ۔ چند ہی برسوں میں آدھے درجن بچے ہو گئے ۔ جب بچے جوان ہوئے تو ان کی شادیاں کر دیں ۔ اس کے بعد پنشن ملی ۔ پنشن ملتے ہی میں نے سوچا پہلے مہنتو سے ملا جائے۔ اس لئے تیرے دولت کدے

پر چلا آیا۔ بھابی کہاں ہے۔ ابھی تک کنوارے ہو کیا؟"

"کنوارے ہی رہتے اگر تیری بھابی ہم سے شادی نہ کر لیتی!"

"یعنی شادی تم نے نہیں کی ہماری بھابی نے تم سے شادی کی۔"

"بس یہی سمجھ لو۔"

"بھابی ہے کہاں۔ ذرا ان کی صورت تو دکھا دو!"

"سودا سلف لینے گئی ہے۔"

"اتنے امیر ہو کر بھی نوکر نہیں رکھا؟"

"تمھاری بھابی نوکر رکھنے نہیں دیتی۔ بے حد گھریلو قسم کی عورت ہے، سارا کام خود کرتی ہے۔ بس برتن مانجھنے کے لئے ایک نوکرانی رکھی ہوئی ہے، باقی تمام خود ہی کرتی ہے۔"

"کتنے بچے ہیں؟"

"کوئی نظر آتا ہے تمھیں؟"

"حکومتِ ہند سے پہلے ہی تم نے فیملی پلاننگ کا آغاز کر دیا تھا۔"

"ہم تو مستقبل پر نظر رکھتے ہیں پیارے!"

"کیا کھاؤ گے!"

"جو کھلاؤ گے؟"

"تو آدھا ناشتہ تم کر لو۔ باقی جو بچے گا ہم کھا لیں گے۔"

"بوریا بستر کہاں ہے تیرا؟"

"ہوٹل میں۔"

"سیدھے یہاں کیوں نہیں آئے؟"

"تمھارا کیا ٹھکانا۔ گھر میں نہ ملتے تو کیا کرتا۔ بھابی مجھے پہچاننے سے رہی۔ میں

کہاں سے ثبوت لاتا کہ میں تمہارے بچپن کا دوست ہوں۔"

"ہاں بات تو درست کہتے ہو، تمہاری بھابی بڑی شکّی قسم کی عورت ہے۔ ہر آنے جانے والے پر بڑی نظر رکھتی ہے۔"

"خیر مہنت یہ تو بتا، کیسے گزری تمہاری زندگی؟ یوں تو تیرے جیون کے واقعات، تمہاری شرارتوں ــــ حماقتوں ــــ اور تمہاری الفتوں کے افسانے اخباروں میں پڑھتا رہا۔ کبھی فخر سے ہمارا سینہ تن گیا اور کبھی ہم شرمسار بھی ہوئے پھر بھی ایک نکتہ ہماری سمجھ میں نہ آیا کہ تم بڑے لاابالی قسم کے نوجوان تھے اپنے پاؤں میں بیڑیاں کیسے ڈال لیں؟"

"گرہستھ آشرم کی!"

"جب گھر سے بھاگا تھا راجو! تو میں نے تم سے کہا تھا نا کہ سر پر کفن باندھ کر جا رہا ہوں۔ ناکام واپس نہ آؤں گا، یاد ہے نا تمہیں؟"

"تمہاری شہرت اور دولت کے قصے تو میں سن چکا۔ تمہاری جوانی کی فلمیں بھی دیکھیں اور ادھیڑ عمر کی بھی۔ تمہارے فن سے بے حد مرعوب ہوا۔ مجھے تمہارے بیرونی جاہ و جلال سے کوئی خاص دلچسپی نہیں۔ صرف یہ بتاؤ کہ تم تو سکرین کے مشہور و معروف ویلن تھے اور اس کے علاوہ بے حد بے باک، نڈر اور شیطان قسم کے آدمی تھے۔ تم اس چکر میں کیسے پھنسے؟"

بھابی سے پوچھ لینا۔"

"بھابی اپنا راز کیوں بتائے گی، تم ہی بتاؤ۔ جب تک میں ناشتے پر ہاتھ صاف کرتا ہوں۔"

"یہ تو جانتے ہو راجو کہ سکول میں ہم ناٹکوں میں حصہ لیتے تھے۔ پڑھائی میں سب سے پیچھے، غنڈہ گردی میں سب سے آگے! ڈرنا ہم نے سیکھا نہ تھا۔ بس لڑنا ہم جانتے تھے۔ چرب زبانی میں ہم یکتا تھے۔ چھٹے دار زبان بولنے میں ہمارا کوئی ثانی نہ تھا۔ بمبئی میں آکر ہم

نے کتنے ہی سٹوڈیو کے چکر لگا کر ہم نے یہ محسوس کیا کہ اس طرح اندر جانے کی اجازت نہ ملے گی۔ تمھیں ہماری ذہانت کی داد دینا پڑے گی کہ ہم نے چوکیدار سے مل کر، انھیں دو چار عشقیہ شعر سُنا کر اندر جانے کی اجازت لے لی۔ ڈائرکٹر سے ملنے کی بجائے ہم سیدھے سیٹھ جی سے ملے۔ دو چار لطیفے ایسے سُنائے کہ سیٹھ جی نے اپنی فلم کمپنی میں نوکر رکھ لیا۔ آج سے تیس برس پہلے کی بات کر رہا ہوں۔ اس وقت تنخواہ بہت کم ملتی تھی۔ فلموں میں کام کرنے والے اَن پڑھ تھے۔ خاص کر ان دنوں اس پیشے کو حقارت کی نظر سے دیکھا تھا۔ آج کل تو شریف گھرانوں کی لڑکیاں بھی ایکٹریس بننے کے لئے ماری ماری پھرتی ہیں۔ سچ پوچھو راجو تو یہ سب قسمت کے کھیل ہیں۔ بے ہودگیاں، خرمستیاں، چالاکیاں اور دوسری اسی طرح کی گھٹیا باتیں ہمارے کام آئیں، اور ہم بامِ عروج پر پہنچے۔ شروع میں ایکسٹرا کا رول ملا۔ دوسرے ایکٹروں سے ہم بہتر زبان بولتے تھے۔ سیٹھ نے ہماری آڑی ترچھی صورت دیکھ کر ایک فلم میں ہمیں ویلن کا رول دیا جب یہ فلم تھیٹر میں لگی تو حضور اُتارنے کے لئے پولیس بلوانی پڑی۔ بس اُس فلم کے بعد ہمارا سکہ جم گیا۔ سیٹھ جی نے ہماری تنخواہ بڑھا دی۔ بس اس زمانے میں ہم نے پر نکالنے شروع کر دیئے۔ ایک بات کا میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں دل کا اتنا بُرا نہیں، جتنا کہ لوگ مجھے سمجھتے ہیں۔"

"مجھے معلوم ہے مہنتو!"

مہنت کمار کھو ڈیر۔ کوئی سُن لے گا تو کیا کہے گا۔"

"ارے مہنت تمھارا کوئی انت نہیں جلدی سے اس قصے کو ختم کرو۔"

"تم سے کیا چھپائیں دوست! جب ہم جوان تھے۔ اس وقت جب کبھی کوئی حسین صورت دیکھ لیتے تو ایک دو شعر بلند آواز سے پڑھ دیتے۔ فلموں میں کام کرنے والی چھوکریاں ہمارے مزاج سے واقف تھیں۔ ہم لڑکیوں سے مذاق کرتے تو وہ بے حد خوش ہوتیں۔ ہم ہلکی پھلکی چھیڑ چھاڑ بھی جاری رکھتے۔ اور اس طرح ہماری مقبولیت بڑھتی گئی۔ اسی دوران میں

سیٹھ جی ہم پر اچھے خاصے مہربان ہو گئے۔ ہم لطیفوں۔ چٹکلوں اور چٹپٹے اشعار سے ہمیشہ لیس رہتے۔ جب کبھی سیٹھ جی سے ملاقات ہوتی، دو چار لطیفے ضرور سنا دیتے۔ وہ بیچارے ہنس ہنس کر دوہرے ہو جاتے۔ سیٹھ جی گھر بلاتے۔ لذیذ کھانے کھلاتے اور کہتے سُناؤ یار چند لطیفے! ہم نمک مرچ لگا کر، بات کو بڑھا چڑھا کر سُناتے، سیٹھانی ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو جاتی، اور ہماری خوش مزاجی کی بہت تعریف کرتی۔ میاں جب قسمت کا ستارہ عروج پر ہوتا ہے تو ہر چول ٹھکانے پر بیٹھتی ہے۔ اور پھر جب جیب میں روپے ہوں تو آدمی راہ سے بے راہ ہو جاتا ہے۔"

جو لڑکیاں فلموں میں کام کرتی تھیں، وہ ہماری پوزیشن اور باتوں سے بے حد مرعوب تھیں۔ سچ بات تو یہ ہے راجو! کہ ہم نے جس پر نظر ڈالی بری ہی نظر ڈالی! پرماتما تو ہمیں جہنم رسید کرے گا، کرنے دو۔ نہ ہم پہلے ڈرتے تھے اور نہ اب۔"

"کوکا کولا پیو گے راجو؟

"تمھارا افسانہ شیطان کی آنت کی طرح لمبا ہوتا جارہا ہے، ذرا اسے مختصر کرو کرو یار! ارے ہاں۔ کولا کہاں ملے گا؟"

"وہ سامنے فرج میں۔"

راجو نے فرج سے کولا نکالا۔ "تو ہاں میاں، ذرا آگے بڑھو!"

"تو بس ان دنوں ہم گرانٹ روڈ پر ایک چھوٹے سے کمرے میں رہتے تھے، کمرے کے ساتھ ایک رسوئی تھی۔ یہی ہماری جنت تھی! دوست یار سیدھے ہمارے کمرے کی جانب رُخ کرتے۔ ایرانی کی دوکان سے چائے۔ بسکٹ، کیک پیسٹری۔ مُرغ۔ مچھلی منگوا لیتے۔ کھانے سے پہلے اور کھانے کے بعد رمی یا فیلش کی محفل جمتی۔ اور کبھی کبھی شراب کا دور چلتا۔ ان دنوں نہ شادی کے بارے میں کبھی کچھ سوچا، نہ بچوں کے بارے میں۔ اپنا سارا وقت تو سٹوڈیو میں گزر جاتا۔ پُرانی اور نئی ایکٹرسوں سے چھیڑ چھاڑ جاری رہتی۔ ان دنوں ہیرو

اور ہیروئن کا اتنا رعب داب نہ تھا۔ بس سیٹھ جی کا حکم چلتا تھا۔ جو بات سیٹھ جی کے مُنہ سے نکل گئی، پتھر کی لکیر ہو گئی۔ ہماری فلمیں چل رہی تھیں اس لئے روپوں کی کمی نہ تھی۔ ہم تو سیٹھ جی کی موچھ کے بال بن گئے۔ ہماری بات کون ٹالے۔ ہمیں عورت سے پیار نہ تھا، اور نہ ہیں نے کبھی عورت کا احترام کرنا کبھی سکھا۔ بس کھاؤ، پیو، اور عیش کرو! کسی عورت پر دل آیا تو اس کا ہاتھ پکڑ لیا! اور قسم پرماتما کی، جس عورت کا ہم نے ہاتھ پکڑا، اس نے ہاتھ نہ چھڑایا۔ ہنستے ہنساتے اسی طرح کا کھیل کھیلتے ہم کافی بدنام ہو گئے۔ فلمی دُنیا میں بدنامی نیک نامی سے زیادہ سود مند ثابت ہوتی ہے۔ اگر آپ ضرورت سے زیادہ شریف ہیں تو غریب ہونے کے زیادہ چانس ہیں۔ ہاں بھئی! میں یہ کہنے والا تھا، جب تمھاری بھابی سے ہماری پہلی ملاقات ہوئی تو ہم انڈسٹری میں کافی بدنام تھے۔ شرابی، کبابی۔ ریس اور رمی کے رسیا، بے حد مُنہ پھٹ، آوارہ، بدصورت۔ لیکن ایک مشہور و معروف ولین ——

اسی دوران ہمارے دوستوں میں اضافہ ہو گیا۔ چند چمچے ارد گرد ایسے جمع ہو گئے جو دن رات ہماری شخصیت اور ہمارے فن کے بارے میں شور و غل مچاتے اور کبھی کسی نئی لڑکی کی طرف اشارہ کرتے تو ہم اسی کے پیچھے ہو جاتے۔ انہی میں سے ایک دن ایک صاحب نے مجھ سے کہا۔ ”ایک ہیرا آپ کے لئے تلاش کیا ہے! لعل ہے گدڑی میں۔ اللہ قسم۔ دیکھو گے تو تڑپ کر رہ جاؤ گے!

”پہلے دکھاؤ۔ پھر تڑپیں گے۔

”میاں سٹ پر چلو۔ ڈانس کی ریہرسل ہو رہی ہے۔ ایک سانولی سلونی لڑکی ہے نام ہے دیپا——!“

”چلو دیکھیں!“

ہمیں روپیہ کمانے اور لڑکیاں دیکھنے کے سوا اور کوئی کام نہ تھا۔ سیدھے سٹ پر گئے، اور دیپا کو کیا دیکھا کہ لٹو ہو گئے! یوں تو لڑکی کا رنگ سانولا تھا۔ جب سانولے

پر شباب آتا ہے تو بے حساب آتا ہے۔ راجو لڑکی کیا تھی بجلی کا کوندا، آندھی، طوفان، بجلی کا کرنٹ۔ ایٹم بم! ہم نے اپنے دوست کی طرف دیکھا۔"

"حضور کا کام ہو جائے گا!"

"ہم کسی کا مارا ہوا نہیں کھاتے۔ لنچ کے بعد ان سے کہو کہ ہم سے مل لے۔"

"اچھا مہنت صاحب۔

لنچ کے بعد دیپا آئی۔ شاید وہ ہماری عادت سے واقف نہ تھی۔ ہم نے آتے ہی اس کی نازک کلائی پکڑی اور اسے اپنی طرف کھینچا۔ زنّاٹے کا ایک ایسا تھپڑ ہمارے گال پر لگا کہ ہم چکرا گئے اور لگے اس کا مُنہ دیکھنے۔ گھگھی ایسی بندھی کہ اپنی ساری جراٴت خطابت اور چرب زبانی بھول گئے!

دیپا ہنس پڑی۔ ہم چونکے۔

"شام کو گھر آؤں گی۔" یہ کہہ کر وہ کمرے کے باہر چلی گئی۔

میری راتیں تو شراب سے روشن ہوتی تھیں۔ سوچا، چکمہ دے کر چلی گئی! شراب کے دو ہی جام پیئے تھے کہ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ دروازہ کھولا۔ سامنے دیپا کھڑی تھی۔ اس نے اس ویرانے پر نظر ڈالی۔ گھر کیا تھا، بس کباڑیئے کی ایک دوکان! وہ سیدھی رسوئی میں گئی۔ جھاڑو لے کر کمرہ صاف کیا۔ پھر بستر پر نئی چادر بچھائی۔ تکیئے کے گندے غلاف کو بدلا۔ رسوئی میں جا کر پلیٹیں صاف کرنے لگی۔ رسوئی سے نکل کر میری پاس آئی اور کہا۔ "دس روپے دینا۔"

میں نے مُسکراتے ہوئے دس روپے دیئے۔ بہت سستا سودا تھا۔ ظالم جال میں پھنس جائے گی! میں نے سوچا!

روپے لے کر وہ کمرے سے نکل گئی۔

آدھا گھنٹہ گزر گیا، وہ نہ آئی۔ میں نے اس عرصے میں دو پیگ اور پی لئے اور اپنی آنکھیں سُرخ کر لیں۔ دس روپے لے کر وہ کہاں جائے گی۔ بھیا راجو! ایک گھنٹے کے بعد وہ واپس آئی۔ میں پانچ پیگ چڑھا چکا تھا! دماغ میں ایک ہیجانی کیفیت برپا تھی۔ دیپا بہت کچھ لائی تھی۔ سبزیاں انڈے اور ایک بوتل مٹی کا تیل۔

"یہ تیل کس لے!"

"آگ جلانے کے لئے۔" دیپا نے جواب دیا۔

"آگ تو پہلے ہی کافی لگ چکی ہے۔ اب اُسے بجھانے کی کوشش کرو۔"

"پہلے کھانا تیار کر لوں۔" دیپا نے ڈانٹ کر کہا۔

ایک گھنٹے میں دیپا نے کھانا تیار کر لیا میں نے دو پیگ اور پی لئے۔ تپائی پر دیپا نے کھانا لگا دیا۔ آملیٹ، دو سبزیاں۔ مولی اور ٹماٹر کا سلاد، مچھلی کا ٹکڑا۔ چٹنی۔ بہت ہی لذیذ کھانا تھا۔ دیپا کے ہاتھ چوم لوں! میں نے اس کی طرف احسان مند نظروں سے دیکھا۔ وہ میری طرف عجیب نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

"اور دوں؟"

"نا بھاگیہ وان۔ جی پرسن ہو گیا!"

وہ رسوئی میں گئی۔ وہیں کھانا کھایا۔

میں دیپا کا انتظار کر رہا تھا۔ انتظار کرتے کرتے جب تھک گیا تو سیدھا رسوئی میں گیا۔ دیپا برتن مانجھ رہی تھی۔

"برتن مانجھ کر ادھر آنا۔"

"ہاں آوں گی۔ پہلے برتن تو صاف کر لوں۔" اس نے آنکھیں دکھاتے ہوئے کہا۔ بستر پر لیٹے آدھا گھنٹہ گزر گیا۔ دیپا نہ آئی۔ میرا خون اُبلنے لگا۔ کیا سمجھتی ہے یہ دو ٹکے کی چھوکری! بات ایسے کرتی ہے جیسے میں اس کا نوکر ہوں۔ میں بھنّایا ہوا رسوئی کی طرف

اس نے مجھے آتے ہوئے دیکھا تو فوراً رسوئی کا کمرہ بند کر دیا اور چٹخنی لگادی! میں دروازہ کھٹکھٹاتا رہا۔ دیپا نے دروازہ نہ کھولا۔ دروازہ توڑنے کو جی چاہا۔ پھر سوچا کہ اگر محلے والوں کو معلوم ہو گیا تو ایک ہنگامہ برپا ہو جائے گا صُبح خبریں گی اس چھوکری کی! جلتا بُھنتا ہوا بستر پر لیٹ گیا۔

صبح سویرے جب آنکھ کُھلی تو دیپا نے مُسکراتے ہوئے چائے کی پیالی میرے ہاتھ میں تھمادی۔ اس سے پہلے ہمیں چائے کے لئے چلّانا پڑتا تھا۔ بستر پر لیٹے ہوئے کوئی لڑکی گرم چائے کی پیالی ہمارے ہاتھ پر رکھ دے تو کیا کہو گے اس لڑکی کے بارے میں؟ میں نے چُپکے سے چائے پی لی۔ پھر لیٹرین گیا۔ لیٹرین سے نکلا تو کہنے لگی "نہانے کے لئے گرم پانی تیار ہے۔" میں نے سوچا چلو آج گرم پانی سے نہالو! نہانے کے بعد کیا دیکھا میز پر ناشتہ تیار رکھا تھا۔ ناشتہ کر کے میں اسٹوڈیو جانے کے لئے تیار ہو گیا۔

"دس روپے دو۔" دیپا نے آنکھیں مٹکاتے ہوئے کہا۔

میں نے سَو کا نوٹ اسے دیا۔ "غریبوں کو رام کرنے کا یہی طریقہ ہے۔"

"اتنے روپے؟"

"تمھیں نہیں چاہئیں؟"

"کس بات کے؟"

"رکھ لو اپنے پاس۔"

اس نے سو کا نوٹ رکھ لیا۔ چلو قصہ تمام ہوا۔ پھنس گئی جال میں!

"گھر نہیں جاؤ گی؟"

"جاؤں گی۔ ایک آدھ گھنٹے کے لئے۔ فلیٹ کی چابی مجھے دیدو!"

میں نے فرش پر چابی پھینک دی اور اسٹوڈیو چلا گیا۔ سو روپے کا نوٹ لے کر

چلی جائے تو جان چھوٹے۔ جو کچھ چرانا ہے چرالے! کون ایسی لڑکیوں کے منہ لگے۔ نہ جانے اپنے آپ کو کیا سمجھتی ہے؟ آئی تھی آگ لینے گھر کی مالکن بن گئی۔ یوں میرے گھر سے کیا لے جائے گی یہاں سگریٹ کے ٹکڑوں، خالی ماچسوں، خالی بوتلوں اور ٹین کے ڈبّوں کے سوا اور کیا رکھا ہے۔

سارا دن اسٹوڈیو میں دل نہ لگا۔ شام کو گھر پہنچا تو کمرے کا نقشہ ہی بدلا ہوا پایا۔ سارا کمرہ آئینے کی طرح چمک رہا تھا۔ کھڑکیوں اور دروازوں پر رنگین پردے لگے ہوئے تھے فرش مرمر کی طرح چمک رہا تھا۔ میں نے ایک شعر گنگناتے ہوئے اپنی قمیص بستر پر پھینک دی۔ دیپا دوڑی ہوئی آئی اور قمیص کھونٹی پر ٹانگ دی۔ میں نے غصّے میں آکر الماری سے شراب کی بوتل نکالی۔ مڑ کر دیکھا تو میز پر کباب اور سلاد کی پلیٹ رکھی ہوئی تھی۔

"پیونا؟ اس نے حکم چلاتے ہوئے کہا۔

میں ڈبل پیگ پی گیا۔ جلدی سے وہ کھانا لے آئی۔ کل کی طرح آج بھی کھانا لذیذ تھا۔ خوب پیٹ بھر کر کھانا کھایا۔ دیپا نے برتن اٹھائے اور رسوئی میں جاکر چٹخنی لگائی اور سو گئی۔

ان جاہلانہ حرکتوں کو دیکھ کر میرا جی جل گیا۔ جی چاہا رسوئی کا دروازہ توڑ کر اندر گھس جاؤں اور سالی کی چٹیا پکڑ کر گھر سے باہر کر دوں۔! پھر خیال آیا ساری رات کہاں ماری ماری پھرے گی۔ خدا ہی جانے اس کا گھر گھاٹ ہے یا نہیں؟ صبح اسے نکال دونگا۔

صبح ہوئی تو دیپا نے مسکراتے ہوئے تپائی پر چائے کی پیالی رکھ دی۔ مجھے رات کو غصہ زیادہ آتا ہے، دن کو کم۔ آج کے دن رہنے دو۔ بیچاری کو کب تک میرا کھانا پکائے گی، برتن مانجھے گی۔ اس کام کے لئے تو میرے گھر نہیں آئی۔ گرم پانی سے نہلا دھلا کر اس نے میرے آگے ناشتہ رکھا۔ میں نے ناشتہ کیا اور جانے سے پہلے میز کی دراز میں پانچ سو روپے رکھ دیئے۔ جب میں دراز میں پانچ سو کے نوٹ رکھ رہا تھا تو وہ

کنکھیوں سے نوٹوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ جب میں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ نگاہیں بچا کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔

تمام دن سٹوڈیو میں کام کرتا رہا۔ آج جال بچھا کر آیا تھا۔ پانچ سو روپے دراز میں رکھے تھے۔ یہ نوٹ لے کر بھاگ جائے تو ہنومان کے مندر میں جا کر دس سیر برفی چڑھاؤں گا! رات کو گھر پہنچا تو دیپا موجود تھی۔ دراز کھولی تو نوٹ غائب تھے۔ دل ہی دل میں خوش ہوا۔

"یہاں پانچ سو روپے کے نوٹ رکھے تھے، کہاں ہیں وہ؟" میں نے ذرا کڑک کر کہا۔

اس نے ساڑھی کے پلو کو کھول کر تین سو کے نوٹ میری ہتھیلی پر رکھ دیئے۔

"باقی؟"

"گھر کے برتن لائی ہوں، ایک نئی میز، دو کرسیاں، نیا سٹوو، چادریں اور دوسری کھانے کی چیزیں"

یہ سب کچھ دیکھ کر میں خاموش ہو گیا۔ پھر میری نظر اس کی پھٹی ہوئی ساڑی کی طرف گئی۔

"اپنے لئے ساڑی کیوں نہیں لائی؟

"لے آؤں گی۔"

جب پینے لگا تو ہر چیز قرینے سے لگی ہوئی تھی۔ یہ لڑکی چیخنے چلانے کا موقع ہی نہیں دیتی!

"یہ لو، ایک سو کا نوٹ۔ کل اپنے لئے ساڑی لے آنا۔"

"اچھا" اس نے روکھے انداز سے جواب دیا، اور میری جھوٹی پلیٹیں اٹھا کر لے گئی۔

اگلی شام کیا دیکھتا ہوں کہ اپنی ساڑیوں کی بجائے میرے لئے پتلون اور قمیصوں کا کپڑا خرید کر لے آئی اور جو روپے باقی بچے تھے، میرے ہاتھ پر رکھ دیئے۔

"یہ کیا؟ اپنے لئے ساڑیاں کیوں نہیں لائی۔

"گھر سے لے آئی ہوں اپنی پرانی ساڑھیاں۔ یہ پھٹ جائیں تو نئی خرید لونگی۔"

"کیا سٹوڈیو میں کام نہ کرو گی؟"

"نہیں۔"

"تو کیا کرو گی؟"

"یہیں رہوں گی تمھارے پاس۔"

"میرے پاس رہ کر کیا کرو گی؟"

"تمھارا کھانا پکاؤں گی، تمھارے برتن مانجھوں گی، تمھارے گھر کی رکھوالی کرونگی تمھاری سیوا کروں گی۔"

"کیوں اپنا وقت ضائع کر رہی ہو، کیا ملے گا نوکرانی کا کام کر کے؟"

"میں نے کچھ مانگا ہے تم سے؟ بس دو وقت کا کھانا دینا اور کچھ نہیں مانگتی!"

ایک مہینہ کام کر رہی میرے گھر میں —— ایک شام جب میں واپس گھر آیا تو کیا دیکھتا ہوں، وہ اپنی پھٹی پرانی ساڑیاں ایک ٹوٹے ہوئے ٹرنک میں رکھ رہی تھی۔

"دیپا؟"

"جی"

"کیا کر رہی ہو؟"

"ٹرنک میں کپڑے رکھ رہی ہوں۔"

"کیوں؟"

"گھر جا رہی ہوں۔" اس نے شرما کر کہا۔

"کیا تکلیف ہے تمھیں یہاں؟"

"میں زبردستی اپنے آپ کو تم پر لادنا نہیں چاہتی۔" اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے۔ "ایک مہینے سے تمھارے پاس رہ رہی ہوں۔ تم نے ایک بار بھی —"

"وہ چپ ہوگئی، کچھ وقفے کے بعد بولی۔" صرف ایک بار تم نے کلائی پکڑی تھی۔"

"تمھارا چانٹا یاد ہے مجھے!" میں نے گال سہلاتے ہوئے کہا۔" دوسری بار جب میں آیا تو تم نے رسوئی کی چٹخنی بند کردی۔ میں اتنا بُرا نہیں کہ تمھارے آگے پیچھے بھاگوں۔ جب تمھاری مرضی ہی نہیں —"

دیپا ٹوٹے ہوئے ٹرنک کو اُٹھا کر جانے لگی۔

میں نے اس کی کلائی پکڑی اور دوسرے چانٹے کا انتظار کرنے لگا۔

"پگلی! تم نے ایک شیطان آدمی کو شریف انسان بنا دیا۔ یہ تمھاری خدمت، سیوا اور ایثار کا معجزہ ہے! اب پھر مجھے کیوں شیطان بنانے پر تُل گئی ہو —!"

دیپا نے ٹرنک رکھ دیا اور میرے سینے سے لگ گئی۔

اگلے دن میں نے اس سے شادی کرلی — "لو وہ آگئی تیری بھابی!"

"آج ایک دیوی کے درشن کر رہا ہوں، جس نے ایک دیو کو دیوتا بنا دیا! نمستے! اچھا اب مجھے اجازت دو۔" راجو نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

"کھانا کھائے بغیر جاؤ گے تو دیوی جی کا ایک چانٹا سہہ لینا۔"

"ارے ہاں! ایک چانٹے نے تیرے جیسے شیطان کو انسان بنا دیا۔ کہیں اسی طرح کا چانٹا مجھے پڑ گیا تو کہیں مجھے اس دُنیا سے کوچ نہ کرنا پڑے!" راجو نے دیپا کی طرف دیکھتے ہوئے اور کُرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ دیپا مُسکرا کر رسوئی کی طرف جلدی!!

چابیاں

ظفر چپڑاسی کی شخصیت کی دھاک تو اسی دن بیٹھ گئی، جس دن میں نے پہلی بار فیکٹری میں قدم رکھا۔ اس نے دیکھتے ہی بڑے مؤدبانہ انداز میں یوں آداب کیا۔ کہ دفتر کے لوگ مجھے دیکھنے کی بجائے ظفر کی جانب دیکھنے لگے۔ اور سلام کے بعد اس نے دفتر کے اندر جانے تک میرا راستہ یوں صاف کیا، جیسے بادشاہ سلامت کی سواری جارہی تھی اور وہ کہہ رہا ہو۔ "با ادب، باملاحظہ ہوشیار"۔

مجھے چاپلوس آدمیوں سے سخت نفرت ہے۔ خاص کر میرے والد محترم نے مجھے اس فیکٹری کو چلانے سے پہلے تنبیہہ کی تھی کہ چاپلوس نوکروں سے محتاط رہنا۔ اسی لئے میں نے پہلی ملاقات میں دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا، کہ ظفر چپڑاسی کو برخاست کر دُونگا میں اسی انتظار میں تھا، جونہی ظفر نے کوئی غلطی کی میں نے اسے برطرف کیا۔ جوں جوں دن گزرنے لگے۔ ظفر چپڑاسی کی شخصیت کی تہیں کھلنے لگیں۔ بجائے اس کے کہ میں اسے یہ بتانے کی کوشش کرتا، میاں تم ایک چپڑاسی ہو، اپنی جگہ پر رہو، اس نے میرے اردگرد ایسا گھیرا ڈالا کہ ظفر چپڑاسی کے بغیر میرا وجود بے معنی سا رہ گیا۔

یوں ظفر میرے کمرے کے باہر ہی بیٹھا رہتا۔ لیکن اندر بیٹھ کر مجھے یوں محسوس ہوتا، جو شخص باہر بیٹھا ہوا ہے، وہی اس دفتر اور فیکٹری کا مالک ہے آج کل میں بالکل کٹھ پتلی کی طرح اس کی گرفت میں تھا، وہ جیسے چاہتا، مجھے نچاتا!

مجھے کٹھ پتلی بنانے میں اسے کافی محنت کرنی پڑی۔ میرے دفتر میں داخل ہونے سے پہلے وہ اپنی جگہ پر موجود رہتا۔ گیٹ سے داخل ہوتے ہی وہ مجھے دیکھ لیتا، اور دس گز کے فاصلے سے ایسے باوقار اور بارعب سلام سے میرا استقبال کرتا کہ دیکھنے والوں کا جی خوش ہو جاتا۔ جونہی میں اپنے دفتر کی طرف مڑتا، تو لپک کر آفس کا دروازہ کھولتا، اندر جا کر میں دیکھتا کہ ہر چیز قرینے اور سلیقے سے رکھی ہوتی۔ قلم۔ دوات، پیڈ، فائلیں، غرض ہر چیز اپنی جگہ پر نپی تلی، سجی سجائی نظر آتی، میز تو شیشے کی طرح چمکتی!

اس صفائی کے علاوہ اس نے کمال صفائی سے اس بات کا پتہ لیا کہ صاحب کا پسندیدہ ڈرنک کون سا ہے، چپکے سے دروازہ کھول کر اندر آتا اور کہتا:

"صاحب، لسی۔"

ظفر کو معلوم ہو گیا تھا۔ صاحب کمرے میں داخل ہوتے ہی لسی کا آرڈر دیتے ہیں۔ بس پہلے دن میں نے لسی کا آرڈر دیا تھا، اس نے اس دن کے بعد پھر آرڈر دینے کا موقع نہ دیا۔ اب تو ہر چیز بغیر مانگے مل جاتی۔ یعنی گولڈ فیک کا پیکٹ ماچس اور تمباکو والا پان۔

میری دیکھ بھال کے علاوہ اس نے میرے ملنے والوں پر ایسا رعب جمایا کہ اس کی اجازت کے بغیر مجھ سے کوئی ملنے کی ہمت نہ کرتا۔

کوئی ملنے آتا، تو وہ راستہ روک کر کہتا:۔

"اس وقت صاحب ایک اہم فائل دیکھ رہے ہیں۔ آپ کو آدھ گھنٹہ انتظار کرنا پڑے گا۔"

صاف ظاہر ہے ملاقاتی کو اگر اہم کام ہو گا تو ٹھہرے گا ورنہ چلا جائے گا۔ گو ظفر چپڑاسی کے اس رویتے سے میرے کئی دوست میرے دشمن بن گئے۔ کیونکہ بہت سے دوست محض گپیں مارنے آتے تھے، سگریٹ پینے، پان کھانے، کچھ اِدھر اُدھر کی ہانکی، اور چلتے بنے۔ اب اس قسم کے دوستوں کا میرے دفتر آنا مشکل تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں، اب سارے دفتر میں میرا رعب داب بیٹھ گیا تھا، سب لوگ کہتے :۔

"اجی نئے صاحب کی کیا بات ہے، اتنی پابندی اور سلیقے سے کام کرتے ہیں کہ فضول باتوں میں ایک سیکنڈ ضائع نہیں کرتے۔ وقت پر دفتر آتے ہیں، اور وقت پر جاتے ہیں۔ معمولی آدمیوں سے تو ملتے ہی نہیں، ہانکتے :"

جوں جوں میرا وقار دفتر میں بڑھ رہا تھا، ظفر چپڑاسی کی گرفت مجھ پر مضبوط ہوتی جا رہی تھی۔

آپ ضرور پوچھ سکتے ہیں، اگر ظفر چپڑاسی نے اپنی محنت، خلوص اور دیانتداری سے سکہ جما لیا تھا، تو اس بچارے کا کیا قصور۔ جناب میرے آنے سے پہلے ظفر چپڑاسی کی ماہوار تنخواہ صرف ساٹھ روپے تھی، اور اب اس کی تنخواہ پچھتر روپے ہے۔ یعنی ایک سال کے اندر اندر اس نے پندرہ روپے کا اضافہ کرا لیا تھا، یہ اس کی بہت بڑی فتح اور کامیابی تھی۔

صرف اپنی تنخواہ بڑھوا لیتا، تو شاید مجھے اتنا افسوس نہ ہوتا۔ اب تو اس نے دفتر کے اندرونی معاملات میں دخل اندازی شروع کر دی تھی یعنی کئی کلرکوں کی تنخواہیں بڑھوادیں ایک دو کے خلاف شکایتیں کر کے انھیں نکلوا دیا۔ اب تو پورے دفتر میں ظفر چپڑاسی کا طوطی بول رہا تھا اور سب لوگ سفارش کرانے کے لئے ظفر کے اِردگِرد گھومتے نظر آتے۔

یہ بات مجھے بالکل اچھی نہ لگی۔ ہاں اگر میں زیادہ ذہین نہ ہوتا، یا ظفر مجھ سے زیادہ تجربہ کار اور پڑھا لکھا ہوتا، یا ظفر میرا آقا ہوتا تو شاید میں ان باتوں پر غور نہ کرتا۔

ایک معمولی سے چپڑاسی کی یہ ہمت کہ وہ ایک فیکٹری کے مالک پر اس طرح چھا جائے اور اسے دو کوڑی کا بنا کر رکھ دے۔ یہ واقعی حیرت انگیز بات تھی، اور میرے لئے پریشانی کا باعث بھی۔

ایک بار تو اس نے کمال ہی کر دیا۔ دفتر میں آیا کہنے لگا:

"حضور!"

"کیا بات ہے؟"

"آپ کی طبیعت ٹھیک ہو تو عرض کروں۔"

"کہو۔"

"جی وہ ـــ" یہ کہہ کر وہ رک گیا

"کچھ کہو تو ہوا کیا؟"

"جی، میری بہن کی شادی ہے۔ اب دیکھئے نا، میری بہن کا میرے سوا اور کون ہے، دراصل میری بھی کیا حیثیت ہے، جو کچھ ہیں، آپ ہی ہیں۔ آپ کی وجہ سے میں نے اپنی بہن کی شادی طے کر لی۔ کتنا بڑا سہارا ہے آپ کا۔ خدا کی قسم۔ جب چلتا ہوں تو سینہ تان کر چلتا ہوں، خدا آپ کا سایہ میرے سر پر ہمیشہ کے لئے رکھے۔"

"روپے چاہئیں ظفر!"

"جی ہاں۔ کتنے روپے بھیج دوں؟ گاؤں میں شادی ہوگی۔ اماں وہیں ہیں۔ ایک سو روپے بھیج دوں۔ حضور! کیا خیال ہے آپ کا؟

"ایک سو سے کیا ہوگا۔ ظفر۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں، مائی باپ، پھر دو سو بھجوائے دیتا ہوں۔"

"ارے ظفر، تمھاری بہن کی شادی ہے، تین سو بھجوا دو!"

"زیادہ تو نہیں ہو گئے صاحب۔"

"تمھاری تو ایک ہی بہن ہے۔ اُس پر سو، دو سو زیادہ ہی خرچ ہو گئے تو کیا ہوا، ظفر۔"

آپ کے مُنہ میں گھی شکر۔ خُدا کی قسم۔ آپ جیسا مالک کہاں ملے گا۔"

"یہ لو تین سو روپیوں کی چِٹ، اور ابھی منشی سے مل کر روپے لے لو۔"

"جو حکم سرکار۔"

چِٹ لے کر وہ چلا گیا۔

تین دن کے بعد وہ پھر میرے کمرے میں آیا۔ "حضور گستاخی معاف۔ اجازت ہو تو عرض کروں۔"

"ہاں، ہاں کہو۔"

"گھر سے اماں کا خط آیا ہے، بس آپ کے گُن گاتی ہیں وہ، اور ساتھ یہ بھی لکھ دیا کہ دو سو روپیوں کی اور ضرورت ہے۔ میں اُنھیں دو سو روپے کہاں سے بھیجوں سرکار۔ غریب آدمی ہوں۔ محض ایک چپڑاسی، پچھتر روپے تنخواہ، اتنا قرض جو اُٹھا رہا ہوں اسے کون چُکائے گا صاحب" میں اماں کو کیا جواب دوں؟ آپ ہی جواب دیجیے گا۔"

"کتنے روپے اور بھیجنا چاہتے ہو ظفر؟"

"جتنے آپ بھجوا دیں۔ خیر، دو سو بھیج دیجیے گا۔ منی آرڈر فارم اپنے مُبارک ہاتھوں سے بھر دیجیے۔ ابھی تار منی آرڈر کرا آتا ہوں۔"

"پہلے مُنشی سے دو سو روپے تو لے کر آو۔"

"حضور ایک عدد چِٹ مل جائے۔"

دراصل اسے کام لینے کا ڈھنگ آ گیا تھا، میری کمزوریوں کو وہ اچھی طرح جانتا تھا۔ میری دُکھتی رگ پر وہ فوراً اُنگلی رکھ دیتا اور مجھے اس کی بات ماننا ہی پڑتی۔

ایک دن مُنہ لٹکا کر پھر میرے کمرے میں آ گیا۔
"حضور گستاخی معاف، اگر جان کی امان ہو تو عرض کروں۔"
"جو کچھ کہنا ہے صاف صاف کہو، اِدھر اُدھر کی مت ہانکنا۔"
"جی، وہ آپ کا ہری رام۔" یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔
"ہاں، اُسے کیا ہوا؟" میں نے غصّے میں آ کر کہا۔
"اچھا حضور۔ کل بتاؤں گا۔ آج نہیں۔" وہ جانے کے لیے مڑا۔
"ارے بات تو بتا کر جاؤ۔"
"پہلے میں بات کی تہہ تک پہنچ جاؤں گا سرکار، پھر آپ سے عرض کروں گا۔"
اگلے دن ظفر کہنے لگا:۔
"صاحب وہ بات تو بالکل سچ ہے۔"
"ابے کون سی بات؟"
"جی وہی خزانچی جی کی۔"
"لیکن کون سی، بتا تو سہی۔"
"بتاتے ہوئے شرم آتی ہے حضور۔"
"شرم کس بات کی؟"
"ہری رام بد دیانت ہے سرکار۔"
"اس نے کیا بد دیانتی کی ہے؟" میں نے چلّا کر کہا۔
"حضور، فیکٹری سے لوہے کی چادریں چوری کر کے بازار میں بیچ دی ہیں، اور جو رقم حاصل کی اسے خود ہضم کر گیا۔"
"ہری رام پر الزام لگانے سے پہلے ایک بار پھر سوچ لو ظفر۔ یہ سودا مہنگا پڑے گا۔"

"سرکار اگر بات غلط نکلے تو میری گردن اُڑا دیجئے گا۔"

"گردن تو نہیں اُڑاؤں گا، لیکن تمہیں ملازمت سے برخاست ضرور کر دوں گا۔ منظور ہے یہ شرط؟"

"سولہ آنے حضور۔"

آج میں بے حد خوش تھا۔ ظفر خود بخود اپنے جال میں پھنس گیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ ہری رام اس قسم کی گھٹیا حرکت نہیں کر سکتا۔ خفیہ طور پر میں نے اس معاملے کی تفتیش کرائی۔ آخر کار مجھے شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ ظفر نے جو الزام لگایا تھا، وہ حرف بحرف درست تھا۔ اگلے دن ظفر کی بجائے ہری رام کو برخاست کرنا پڑا۔

دراصل اس معرکہ آرا واقعہ کے بعد ساری فیکٹری میں ظفر کا ڈنکہ بج گیا۔ اب تو یوں معلوم ہوتا تھا کہ ظفر واقعی فیکٹری کا مالک تھا۔ دل ہی دل میں ظفر کے خلاف نفرت کا لاوا ابھر رہا تھا۔ کمبخت کوئی غلطی نہیں کرتا۔ غصے سے جل بھن رہا تھا۔ دفتر میں آتا، تو ظفر کی صورت دیکھتے ہی میرے تن بدن میں آگ سی لگ جاتی، اور میں ظفر کی صورت دیکھنا بھی پسند نہ کرتا۔ اسی دوران میں میرے ایک دوست بھرے ہوئے آفس میں داخل ہوئے اور آتے ہی مجھ پر برس پڑے:۔

"اجی، عجیب خبیث نوکر ہے آپ کا۔"

"کیا ہوا مالک رام جی؟"

"اور کیا ہو سکتا ہے، پنڈت جی، ایک ہفتے سے ملنے کی کوشش کر رہا ہوں تم سے، تمہارا دو ٹکے کا نوکر کوئی نہ کوئی بہانہ بنا دیتا ہے صاحب ابھی فائل دیکھ رہے ہیں، بس صاحب بلواتا ہوں آپ کو، صاحب ابھی کانفرنس روم میں گئے ہیں، صاحب ابھی فون کر رہے ہیں، ذرا ٹھہر جائیے، پرماتما کی قسم مجھے تو یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے میں اپنے دوست سے نہیں مل رہا ہوں، بلکہ کانگرس کے صدر سے ملنے کی اجازت چاہ رہا ہوں

پنڈت جی آپ بڑے ہوں اپنے گھر ہیں۔ میں تو آپ کے فائدے کے لئے آیا تھا۔ ایک بہت بڑا آرڈر لایا تھا لوہے کی چادروں کا۔ خیر اب چلتا ہوں۔"

"ارے بیٹھئے تو، مالک رام جی۔"

"پہلے اپنے نوکر تمیز سکھائیے۔"

"ظفر۔" میں چلایا۔

ظفر دوڑتا ہوا اندر آیا۔

"تم نے صاحب کو اندر کیوں نہیں آنے دیا۔ بڑے بدتمیز ہو گئے ہو۔"

"جی، جی بس غلطی ہو گئی سرکار۔"

"تو اس غلطی کا خمیازہ بھگتو، اسی وقت دفتر سے حساب بے باق کر کے چلے جاؤ۔ میں تمہارے ایسے نوکر کی صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتا۔ آج سے تمھیں برخاست کیا جاتا ہے سمجھے۔"

ظفر چپڑاسی یہ سب کچھ سنتا رہا۔ میرا خیال تھا وہ گڑگڑائے گا، روئے گا، معافی مانگے گا لیکن وہ خاموش رہا اور چپکے سے کمرے سے نکل گیا۔

شام کو جب گھر پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ آنگن میں چند بچے کھیل رہے تھے، جن کی شکل وصورت سے میں ناواقف تھا۔ اچانک میری نگاہ چارپائی پر پڑ گئی، میری حیرت کا کوئی ٹھکانا نہ رہا، جب میں نے یہ دیکھا کہ ظفر چپڑاسی میرے والد محترم کے پاؤں داب رہا تھا۔

"بیٹے ذرا اندر آنا۔" پتا جی نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیا بات ہے پتا جی؟"

"بیٹا بیٹھو۔"

پھر والد صاحب نے ظفر کو جانے کے لئے اشارہ کیا۔ ظفر چلا گیا۔

"ظفر کو تم نے دفتر سے نکال دیا ہے۔"

"ہاں پتا جی۔"

"کیوں؟"

"میں دفتر کے کام کاج میں کسی قسم کی دخل اندازی پسند نہیں کرتا۔"

"ایک معمولی نوکر کو برخاست کر کے کون سا بڑا کام کیا ہے تم نے؟ بیچارہ غریب ہے، بال بچوں والا ہے، اس وقت کہاں جائے۔"

"جہاں اس کے سینگ سما جائیں، چلا جائے، کیا میں نے ساری عمر کا ٹھیکہ لے رکھا ہے، پتا جی۔"

بیٹے ذرا ہوش کی دوا کرو۔ ایسا نوکر تمھیں زندگی بھر نہیں ملے گا۔ دفتر جانے سے پہلے ظفر ہر روز یہاں آتا، سودا سُلف لا کر دیتا، بہو جس کام کو کہتی تھی کرتا تھا اور سنڈے کے سنڈے تمہارے بچوں کو سیر کرانے لے جاتا تھا۔ تمھیں اس بات کا اندازہ ہی نہیں کہ اس کے بغیر یہ گھر نہیں چل سکتا۔ بے چارے سے ایک معمولی سی غلطی ہو گئی اور تم نے اسے ہمیشہ کے لئے چلتا کر دیا۔ اس کی خدمت کا صلہ تم زندگی بھر نہیں دے سکتے۔ یہ سراسر بے انصافی ہے۔ تمھیں اسے واپس لینا ہوگا۔"

جو کچھ والد صاحب نے کہا تھا، یہ سب باتیں میرے لئے نئی تھیں۔ یہ ظفر کی شخصیت کا دوسرا رُخ تھا، اس نے مجھے گرفت میں لانے سے پہلے، میرے والد محترم کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا، میں نے اپنے چاروں طرف دیکھا، حالات میرے موافق نہ تھے ایک کونے میں میری بیوی کھڑی تھی، اس سے ذرا دور کھڑے میرے دو بچے مجھے گھور گھور کر اس طرح دیکھ رہے تھے، جیسے میں نے کوئی بہت بڑا جُرم کیا تھا۔

"میں اب ظفر کو نوکر نہیں رکھوں گا پتا جی، یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔"

"میرا آخری فیصلہ بھی سُن لو، اگر تم ظفر کو بحال نہیں کرو گے، تو میں اس گھر میں نہیں رہوں گا۔ میں ابھی اور اسی وقت جاتا ہوں ——" وہ جانے کے لئے اُٹھنے

"پتا جی۔"

میں نے بیوی کی طرف دیکھا، اس سے پہلے کہ وہ پتا جی کی بات دُہرائے، میں نے ہتھیار ڈال دیئے اور کہا:۔

"اچھا پتا جی، میں ظفر کو بحال کرتا ہوں۔"

"صرف بحال ہی نہیں کروگے، اسے ترقی بھی دینا پڑے گی۔"

"دوں گا پتا جی۔"

"کمبخت ہر جگہ مجھے ہی شکست دینا ہے، ظفر کا بچہ، یہ کہہ کر میں اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔

ظفر پھر واپس آگیا اپنی نوکری پر دو سال اسی طرح گزر گئے۔ پھر اچانک ۱۹۴۷ء کا بھیانک دور آیا۔ قتل و غارت گری، کا ایک سیلاب اُمنڈ پڑا، اس خونی دور میں ظفر آہنی دیوار بن کر ہماری حفاظت کرتا رہا، جب میں نے یہ اچھی طرح محسوس کر لیا کہ اب یہاں رہنا مشکل ہی نہیں، بلکہ ناممکن ہے، تو میں نے فیکٹری کو تالا لگا دیا، سامنے ظفر چپڑاسی کھڑا تھا۔

"حضور جا رہے ہیں" ظفر کی گلو گیر آواز میں بے حد مایوسی، دُور اُداسی تھی۔

"ہاں ظفر"

میں نے ظفر کی طرف دیکھا، اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

"ظفر اس سے پہلے بھی میرے دل، دماغ کی چابیاں تمھارے پاس تھیں، آج اس فیکٹری کی چابیاں تمھارے حوالے کرتا ہوں، دراصل تُم ہی اس فیکٹری کے مالک ہو۔" ظفر کو چابیاں دے کر میں کار کی طرف لپکا۔

آخری شاٹ

جوانی کی پھلواری میں جب آرزوؤں اور تمناؤں کے پھول کھلتے ہیں تو والدین کی روک ٹوک اور ان کے مشورے ذرا بھی اچھے نہیں لگتے، پُشپا بھی اس قسم کے دَور سے گزر رہی تھی۔ گورمُکھ سے جب اس کی پہلی ملاقات ہوئی تو وہ اس کے اُونچے قد، سڈول جسم اور خوبصورت چہرے پر مر مٹی۔ اس نے ایک لمحے کے لیے بھی یہ نہ سوچا کہ مستقبل میں ان چیزوں سے کیا فائدہ پہنچے گا۔ وہ خود بھی موسم بہار کا ایک جھونکا تھی۔ جدھر نکل جاتی، لڑکوں کے غول کے غول کلیجہ تھام کر اس کی طرف دیکھتے رہ جاتے۔ سامنے سے آنے والے اس کی غلافی آنکھوں، کھُلی پیشانی اور کالی گھٹا کی طرح سیاہ بالوں کی تعریف کرتے، اور پیچھا کرنے والے اس کے جسم کے دل فریب خطوط سے لُطف اندوز ہوتے۔

بات ہونٹوں سے نکلی اور کوٹھوں چڑھی، اور اس چھوٹے سے شہر میں ہر زبان پر پُشپا اور گورمُکھ کی مُلاقاتوں کا چرچا ہونے لگا۔ ماں باپ نے بہت روکا ٹوکا مگر پُشپا نے کسی کی بھی نہ سُنی۔ رات کی سیاہی میں عشق نے خوب پاؤں پھیلائے اور پُشپا اپنی

ساری سُدھ بُدھ کھو کر گورمکھ کی آغوش میں جا گری ــــ اور جب اس کی آنکھ کھُلی تو اُسے پتہ چلا کہ رات کی سیاہی اپنا ورثہ اس کی کوکھ میں چھوڑ گئی ہے۔ اب کیا ہو سکتا تھا سوا شادی کے؟ جب پُشپا جانے لگی تو پُشپا کے پتا نے اپنی بیٹی سے صاف صاف کہہ دیا:۔

"بیٹی اس گھر میں دوبارہ قدم نہ رکھنا۔"

گورمکھ بی۔ اے پاس تھا، جلد ہی اسے ایک بینک میں کلرک کی جگہ مل گئی۔ اس نے اپنی بیوی کے لئے ایک کمرہ لے لیا۔ پُشپا اگر ایک معمولی سے گھرانے میں پلی ہوتی تو بیری کے لئے ایک کمرہ بہت ہوتا۔ لیکن اس نے بہت اچھے دن دیکھے تھے، والدین نے بڑے ناز ونعم سے پالا پوسا تھا۔ گھر میں سب کچھ تھا۔ آگے پیچھے نوکر چاکر، شاندار کوٹھی۔ اطلس وکمخواب پر چلنے والی کو رہنے کے لئے صرف ایک کمرہ ملا۔ شادی کو ہوئے ایک سال بھی نہ گزرا تھا کہ ایک بیٹی کا اس کمرے میں اضافہ ہو گیا۔ عشق کا بھوت آہستہ آہستہ اُترنے لگا۔ چھوٹی بچّی کے پوتڑے دھونے پڑتے۔ گورمکھ کا کھانا پکانا پڑتا۔ اور جب کبھی برتن مانجھنے والی نہ آتی تو برتن بھی صاف کرنے پڑتے۔ ڈیڑھ سال میں ہی ہوش ٹھکانے آگئے۔ گورمکھ کی تنخواہ ہی کیا تھی صرف دو سو روپے ماہوار۔ اس مہنگائی کے زمانے میں دو سو روپوں سے کیا بنتا ہے، انسان اکیلا ہو تو رو دھو کر اپنی زندگی کے دن بسر کر دے، مگر محلے والے کہاں چین لینے دیتے ہیں روز آکر پُشپا کے زخموں پر نمک چھڑکتے۔

ایک کہتی ــــ "ہائے رام، کیا صورت پائی ہے تم نے۔ کسی اچھے آدمی کے پلّے پڑتیں، تو شاندار کوٹھی میں رہتیں۔ اجی رانیوں کی طرح راج کرتیں۔"

"پھوٹ گئی قسمت بے چاری کی" دوسری ترس کھاتی۔

"عُمر بھر کا روگ لگ گیا" تیسری ہاتھ نچا کر ہمدردی جتاتی۔

شروع میں گورمکھ کی خوبصورتی پناہ کے کام آئی۔ مگر کب تک اس مہنگائی کے زمانے میں عورت اپنے سہاگ کا رنگ روپ کتنے دن دیکھے، اب تو روز کا یہی رونا دھونا تھا ــــ

کب تک اس کمرے میں رہوگی؟ یہ چاند سا مکھڑا، یہ غلافی آنکھیں، اور رنگ روپ کا اُمنڈتا ہوا سیلاب کس کام کا؟ بس دن رات چولھے کے ساتھ لگی رہو، اور بچّی کے پوتڑے دھوؤ، اور پھر کھانا پکاؤ۔ اب تو پھول سا چہرہ کملانے لگا ہے۔

پُشپا کو اپنے والدین پر پورا بھروسہ تھا کہ ایک نہ ایک دن اسے ضرور منا کے لے جائیں گے۔ پھر وہ اپنے میکے سے بہت سی چیزیں لائے گی۔ ہوسکتا ہے کہ اس کے پتا جی کا دل پسیج جائے اور امداد کے طور پر اچھی خاصی رقم دے ڈالیں، تاکہ دونوں خوشگوار زندگی بسر کرسکیں۔ لیکن شادی ہوئے دو تین سال ہو گئے تھے، والدین نے بلانا تو دور کی بات ہے، سرے سے کوئی خط ہی نہیں لکھا تھا۔ اب اُمیدوں کے سارے دروازے بند ہو چکے تھے۔ شادی سے پہلے اس نے گورمکھ کے بارے میں کچھ سوچا تھا۔ خوبصورت ہونے کے علاوہ گورمکھ ذہین بھی تھا۔ اس سے بڑی بڑی امیدیں وابستہ کی جاسکتی تھیں۔ لیکن شادی کے بعد گورمکھ اتنا ناکارہ، ٹھس اور کند ذہن ہوگیا کہ اس سے کسی قسم کی اُمیدیں وابستہ رکھنا ہی بے وقوفی تھی۔ بس دن رات پُشپا کے حُسن کی تعریفیں کرتا رہتا، یا اپنی گوری چِٹّی بیٹی کو چومتا چاٹتا رہتا۔ پُشپا کا دل پھڑ پھڑانے لگتا۔ ہائے اس دوزخ سے باہر نکلنے کی کوئی تو ترکیب سوچو۔ کیا سارا جیون اسی ایک کمرے میں گزار دوگے۔ یہ کیسا اُجڑا سا گھر تھا۔ چاروں طرف بھنبھناتی ہوئی مکھیاں۔ نہ کھانے کا مزا، نہ پکانے کا، بس دوسرے تیسرے مہینے کہیں جاکر ایک فلم دیکھ لو، آگ لگے ایسی نوکری کو۔ بھاڑ میں جائے ایسا خاوند، جو ساری آرزوؤں اور تمناؤں کو موت کی نیند سُلا دے۔ اس دُنیا میں انسان ایک ہی بار تو پیدا ہوتا ہے، اور پھر بھی یہ جیون رو رو کر کاٹا جائے؟ آخر کیوں؟ چھی چھی!

لوگ درست ہی کہتے ہیں کہ خدا جب دیتا ہے چھپر پھاڑ کر دیتا ہے۔ پُشپا نے

اخبار میں اشتہار کیا پڑھا کہ رات بھر نیند بھی نہیں آئی۔

ضرورت تھی ایک نئی ہیروئن کی۔ تین سال کا کنٹریکٹ۔ پندرہ سو روپے ماہوار تنخواہ۔ ملنے کا پتہ بھی درج تھا۔ پشپا نے پہلے سوچا، پہلے گورمکھ سے بات کرلی جائے پھر سوچ کر یہ فیصلہ کیا کہ یہ خوبصورت آدمی بڑا جاہل ہے، ہوسکتا ہے کہ کوئی اڑچن ڈال دے پہلے اس فلم کے ڈائرکٹر سے مل کر بات کرلی جائے۔ اگر معاملہ طے ہوگیا تو وارے کے نیارے ہوجائیں گے۔

اگلے دن وہ بن ٹھن کر آئینے کے سامنے کھڑی ہوگئی اور اپنی شکل وصورت کا جائزہ لینے لگی —— ہائے وہ کتنی خوبصورت تھی۔ اسکول اور کالج کے کئی ڈراموں میں حصہ لے چکی تھی۔ آنکھیں مٹکانا، کولھے ہلانا اور بلاوجہ مسکرانا اُسے خوب آتا تھا۔ اس نے ہندستانی فلمیں دیکھی تھیں۔ ایکٹنگ کا معیار بس یونہی سا تھا لیکن اس کے حسن اور جسم کی دلکشی اور رعنائی سے ہر شخص مرعوب تھا۔

اب اس کے خواب کے پورے ہونے کے دن آئے تھے، وہ خوش حال اعلیٰ اور معیاری زندگی بسر کرنے کی خواہش مند تھی۔ ایک شاندار فلیٹ، فرش پر دبیز قالین مسہریوں پر ریشمی چادریں۔ دروازوں اور کھڑکیوں پر رنگین پردے، الماریوں میں خوش رنگ ساڑیاں۔ اور اپنی مسہری کے قریب فون، تاکہ وہ آرام سے لیٹ کر، اپنے لمبے لمبے سیاہ بالوں کو تکئے پر جھٹک کر کسی کو فون کرے۔ گیراج میں کار ہو، اس کے آنے کا ڈرائیور انتظار کرے اس کا جس وقت جی چاہے گھومنے نکل جائے، بھارت کے مختلف ہل اسٹیشنوں کی سیر کرے، اور پھر ساری دُنیا دیکھے، اخباروں میں اس کے فوٹو چھپیں —— لڑکے اور لڑکیاں آٹوگراف لینے کے لئے اس کے پاس آئیں، جس سڑک پر اس کی کار دندناتی ہوئی نکلے، لوگوں کا ہجوم اسے دیکھنے کے لئے بے تاب ہوجائے۔ دیکھنے والے چیخیں، چلائیں، شور مچائیں۔ بس ایک ہنگامہ سا برپا ہوجائے، یہاں تک کہ پولیس آکر امن قائم کرے....

یہی کچھ سوچتی ہوئی وہ کارونیشن ہوٹل میں داخل ہوئی۔ کمرے میں داخل ہونے سے پہلے اسے ایک دو مشتبہ قسم کی لڑکیاں ملیں۔ شاید یہ لڑکیاں بھی اسی کام کے لئے آئی تھیں۔ ایک لمحہ کے لئے اس کا ماتھا ٹھنکا۔ قدم لڑکھڑائے مگر ریشمی پردوں، اور قالینوں، اور شاندار فلیٹ کے تصوّر نے اسے آگے بڑھنے پر مجبور کر دیا۔

جب پُشپا کمرے میں داخل ہوئی تو ایک ادھیڑ عُمر کے بدصورت آدمی نے اس کا سواگت کیا۔ زندگی میں پہلی بار وہ کسی غیر مرد کے ساتھ کمرے میں اکیلی تھی۔ اس کے ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے۔

"تشریف رکھئے۔" ادھیڑ عُمر کے آدمی نے کہا۔

"میں ڈائرکٹر کرماتی سے ملنا چاہتی ہوں۔"

"خاکسار ہی کا نام ہے۔ اور آپ کا؟"

"پُشپا۔"

"یہ نام نہیں چلے گا۔ نام بدلنا پڑے گا آپ کو۔" اس نے گھور کر پُشپا کی طرف دیکھا "ذرا چلیے۔" پُشپا آگے بڑھی "واہ وا۔ بجلی کی طرح بڑھتی ہیں آپ ـــــ رکئے ـــــ سُبحان اللہ طوفان واقعی رُک گیا ـــــ ذرا بولئے۔"

وہ بولی۔

"آواز میں واقعی جادو ہے، جادو۔ اتنی میٹھی۔ مدھ بھری آواز میں نے کبھی نہیں سُنی ـــــ کہاں تھیں آپ اتنا عرصہ؟"

"اپنے کمرے میں۔"

"اس کمرے کو اب چھوڑیئے، اور اس شرم و حیا کے لبادے کو بھی اُتار پھینکئے۔ اگر زندگی میں کچھ کرنا ہے تو! میرا نام شاید آپ نے نہیں سُنا ہوگا۔ میری فلمیں دیکھی ہیں آپ نے؟"

”جی نہیں۔“

”میں اسسٹنٹ فلموں کا سب سے مشہور ڈائرکٹر ہوں۔ لیکن اب مار دھاڑ کی فلموں کا زمانہ بیت گیا —— میں ایک معرکہ کی سوشل فلم بنانا چاہتا ہوں۔ اس کے لئے مجھے نئی ہیروئن کی ضرورت ہے جو کسی اچھے خاندان سے تعلق رکھتی ہو۔ آپ کی صورت دیکھ کر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ آپ ہی میری فلم کی ہیروئن بن سکتی ہیں۔“

”بڑی جلدی آپ نے فیصلہ کر لیا۔“ پُشپا بھی بے جھجک ہو کر بات کرنے لگی۔

”ہیرے کو پرکھنے میں کیا دیر لگتی ہے۔“

کرمانی نے تالی بجائی۔ دو فوٹو گرافر کمرے میں داخل ہوئے۔

”ذرا مس پُشپا کے فوٹو لے لو۔“

انھوں نے چند منٹ میں پُشپا کے مختلف پوز کے فوٹو اُتار لئے۔ اشارہ پاتے ہی دونوں فوٹو گرافر کمرے سے نکل گئے۔

”تو ہاں پُشپا جی —— جو کچھ پوچھوں، سچ سچ بتایئے گا —— آپ ابھی مس ہیں، یا کسی کی بیوی؟“

”جی شادی نہیں کی۔“ جب یہ الفاظ پُشپا نے کہے تو اس کی پیشانی پر پسینہ سا آگیا۔

”بہت خوب، پُشپا جی، دراصل ہیروئن کو شادی نہیں کرنی چاہیئے۔ جب تک وہ شادی نہیں کرتی، فلم دیکھنے والوں کے دل اسے پانے کے لئے دھڑکتے رہتے ہیں اور جب وہ شادی کرتی ہے تو ان کے خوابوں کی دُنیا ویران اور بنجر ہو جاتی ہے۔ آپ کے بچّے؟ ارے ہاں۔ بھول گیا۔ آپ نے تو شادی ہی نہیں کی —— بچّے کہاں سے آئیں گے؟“

”ایک بچّی ہے۔“

"ہیں! کس کی؟"

"میری بہن کی۔"

"اوہ — عمر کیا ہے؟"

"ڈیڑھ دو سال کی۔"

"چلے گی۔"

"کوئی اور رشتے دار؟"

"ایک بھائی۔"

"وہ تو ہونا ہی چاہیئے۔ ورنہ آپ اکیلی بمبئی کیسے جائیں گی۔ اس کے علاوہ کوئی اور رشتے دار — نانی۔ ممی، بہن، چاچی، چاچا؟"

"جی اور کوئی نہیں۔"

"ویری گڈ۔ نیٹ اور کلین ہے فیملی آپ کی۔ یہ کوئی بُرا پیشہ نہیں ہے پُشپا جی! اگر آپ دل لگا کے کام کریں گی تو شہرت اور دولت آپ کے قدم چومے گی۔ اب اگر میں اصل مقصد پر آجاؤں تو آپ کو کوئی اعتراض تو نہ ہوگا؟"۔

"فرمایئے۔"

"پندرہ سو روپے ماہوار آپ کو ملیں گے۔ تین سال کا کنٹریکٹ آپ کو کرنا پڑیگا۔ رہنے کے لئے سجا سجایا فلیٹ مُفت میں ملے گا۔ گھومنے پھرنے کے لئے کار حاضر ہوگی۔ تین سال تک آپ باہر کام نہیں کر سکتیں۔ اگر یہ شرطیں منظور ہوں تو اس کنٹریکٹ پر دستخط کر دیجیئے، ورنہ جیسے آپ کی مرضی۔"

پُشپا نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے کنٹریکٹ پر دستخط کر دیئے۔

"لیجیئے، پانچ ایڈوانس، اور بمبئی چلنے کی تیاری کیجیئے۔"

پُشپا نے سو سو روپے کے پانچ نوٹ اپنے بٹوے میں ڈالے، اور اجازت

لے کر کمرے سے باہر نکلی۔

رات کو جب پُشپا نے الف لیلیٰ جیسی داستان گورمکھ کو سُنائی تو اسے یقین نہ آیا، لیکن جب پُشپا نے سو سو کے پانچ نوٹ دکھائے تو گورمُکھ خوشی سے اُچھل پڑا۔

"فائن پُشپا فائن، ارے ونڈرفُل۔ تم نے آج اپنی قابلیت اور ذہانت کا سکہ جما دیا۔ آج سے ایک سُنہری دور کا آغاز ہو رہا ہے۔"

"تم بھی میری ہی طرح ...." یہ کہہ کر وہ چُپ ہو گئی۔

ایک ہلکا سا جھٹکا اسے لگا۔ کم بخت نے ایک بار بھی نہ کہا کہ میں اکیلی کیوں گئی تھی۔ ہماری خانگی زندگی کا کیا ہو گا۔ میں نے کتنے بڑے جھوٹ بولے تھے خاوند اور بیوی کے تعلقات میں جو تبدیلیاں آئیں گی، ان کا کیا ہو گا؟ کنٹریکٹ اور پانچ سو روپے دیکھ کر سب کچھ بھول گیا۔ یُوں معلوم دیتا ہے جیسے کنٹریکٹ مجھے نہیں، اسے ملا تھا، ظاہری طور پر کتنا خوبصورت اور حسین لگتا ہے، اندر سے کتنا عیار اور چالاک!

پُشپا نے گوُمکھ کو سب کچھ بتا دیا۔ گورمُکھ نے ساری باتیں سُن کر آخر میں بس ایک جُملہ کہا ___ "جب تک دُنیا کو بے وقوف نہ بناؤ روپیہ نہیں ملتا۔"

یہ جواب سُن کر پُشپا نے زیادہ سوچنا مناسب نہ سمجھا۔

گورمُکھ نے بینک کی نوکری چھوڑ دی اور اپنی بیوی کے ساتھ بمبئی روانہ ہو گیا۔ ڈائرکٹر کرمانی اسٹیشن پر موجود تھا، وہ سیدھا انھیں بالکیشور روڈ پر ایک شاندار بلڈنگ میں لے گیا اور ایک سجے سجائے فلیٹ میں پہنچا دیا۔

"تو یہ آپ کے بڑے بھائی ہیں؟" کرمانی نے پُشپا کی طرف دیکھتے ہوئے دریافت کیا۔

"ہاں" ہاں کہتے وقت پُشپا نے یہ محسوس کیا جیسے اس کے دل کو کسی نے

چیرڈالا ہو۔

"اور یہ ہے آپ کی بہن کی بیٹی؟"

"جی ہاں"۔

"بڑی چھوٹی سی فیملی ہے آپ کی۔ بس اسے بڑھنے نہ دیجئے۔ ڈائرکٹر کرمانی ایک کارڈ دے کر چلا گیا۔

گورمکھ چپ رہا۔ پُشپا تو سُن سی ہو گئی۔ کاٹو تو بدن میں لہو ہی نہیں ـــــ اُس نے سوچا، یہ کیسا خاوند ہے جسے بھائی کہلواتے ہوئے بھی شرم نہ آئی میں کس قسم کی عورت ہوں جو اپنی بیٹی کو اب اپنی بیٹی نہیں کہہ سکتی۔

پُشپا نے چاروں طرف دیکھا۔ فلیٹ بڑا خوبصورت تھا۔ دروازوں پر لگے ہوئے پردے ہوا میں جھوم رہے تھے۔ اتنے میں نوکر نے آکر آواز دی اور کہا:

کھانا ڈائننگ میز پر لگا ہے میم صاحب!"

"چلو کھانا کھائیں"۔ گورمکھ نے کہا۔

دونوں کھانا کھانے لگے۔ کھانا واقعی لذیذ تھا۔ گورمکھ نے ایسا کھانا کبھی نہ کھایا تھا۔ کھاتے ہوئے وہ سب کچھ بھول گیا۔ ڈائرکٹر کرمانی نے کیا کہا تھا، سامنے بیٹھی ہوئی عورت سے اس کا کیا رشتہ تھا۔ اتنا اچھا کھانا کھانے کے بعد اسے غنودگی سی آنے لگی اور وہ اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گیا اور نیند کی سنہری وادیوں میں کھو گیا۔

اور جب وہ جاگا تو بمبئی آئے ہوئے ایک سال بیت گیا تھا۔ یوں وہ سب کچھ دیکھ رہا تھا، سب کو پہچان رہا تھا۔ لیکن اب وہ پہلے سے زیادہ موٹا اور کُند ذہن ہو گیا۔ اسے اب صرف دو چیزیں پسند تھیں، تندوری مُرغ اور وسکی۔ اس نے پُشپا سے کبھی نہ پُوچھا کہ تُم کہاں جاتی ہو، اور کہاں سے آتی ہو۔ گھر میں تنخواہ باقاعدگی سے آتی تھی۔ روپیوں کی کمی نہ تھی۔ فلم بن رہی تھی۔ پُشپا کی ایکٹنگ کا چرچا خوب زور شور سے ہو رہا تھا،

ہر شخص اپنے آپ سے خوش تھا۔
اگر کوئی ناخوش تھا تو وہ تھا ــــــ کرمانی۔

یہ اس رات کا ذکر ہے جب کرمانی پُشپا کو فلم دکھا کر اسے اپنے فلیٹ میں لا رہا تھا۔

"مجھے اپنے گھر پہنچا دو۔"

"پہلے میرے فلیٹ میں چلو، تم سے چند ضروری باتیں کرنی ہیں۔"

پُشپا نے انکار کرنے کا ارادہ کیا، مگر دل نے کہا، ابھی تک فلم نامکمل ہے۔

دونوں فلیٹ میں داخل ہوئے۔

"تم نے فلم دیکھی پُشپا؟"

"ہاں۔"

"کیسی لگی؟"

"بہت اچھی۔"

"تمھیں اپنا کام پسند آیا؟"

"واقعی آپ نے میرے رول میں جان ڈال دی۔ اسکرین کا ایک چمکتا ہوا ستارہ بنا دیا۔ اور اس کے ساتھ مجھے اس بات کا احساس ہے کہ واقعی آپ فرشتہ سیرت ہیں۔ بے حد نیک اور بہت بلند!

کرمانی کے ہونٹوں پر ایک کھسیانی ہنسی اُبھر آئی۔ "نیکی اور پارسائی کا مجھ سے دور تک کوئی رشتہ نہیں پُشپا۔ جھوٹ بولنے سے کوئی فائدہ نہیں جس دن میں نے تمھیں پہلی بار ہوٹل میں دیکھا تھا اسی دن دل دے بیٹھا تھا۔ دل دینے کا یہ مطلب نہیں کہ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ شادی تو میں نے کی ہی نہیں اور نہ کروں گا۔ بس یہ عرض

کرنا چاہتا ہوں کہ جب تمھیں دیکھتا ہوں تو میں کانپ سا جاتا ہوں۔ تمھارے جسم کی رعنائی اور دل کشی نے مجھے کئی راتیں جاگنے پر مجبور کیا۔ میں تم سے کیسے کہتا کہ میں تمھیں اپنے بازوؤں میں جکڑنا چاہتا ہوں، کام کے دوران، میں نے آرٹ سے کبھی بے وفائی نہیں کی۔ فلم تقریباً تیار ہے ___ میری ایک سال کی دن رات کی محنتوں کا نتیجہ۔ ایک ایک شارٹ کو میں نے سو سو بار سوچا ہے۔ تمھاری حسین صورت کو ہر زاویے سے دیکھا۔ تمھارے جسم کے ہر موڑ کو فلم کے ہر فریم میں اُجاگر کرنے کی کوشش کی، تمھاری مدھری آواز کو کتنی ہی بار ساؤنڈ ٹرک پر سُنا ہے۔ تمھاری سانسوں کی لے پر کتنی ہی بار میرا دل دھڑکا ہے۔ میں اس عرصے میں کتنی بار جیا اور کتنی بار مرا، میں نے کتنی مصیبتیں جھیلیں، کتنے دُکھ اُٹھائے، فنانسر کی دہلیز پر کتنی بار ماتھا رگڑا ___ اس کے بارے میں کوئی کچھ نہیں جانتا۔ جب اسکرین پر تمھاری فلم ریلیز ہوگی اور لوگ تالیاں بجائیں، شور مچائیں گے۔ واہ واکریں گے، جب تمھیں دیکھنے کے لیے ان کی آنکھیں بے تاب ہو جائیں گی۔ جب تم سے آٹوگراف لینے کے لیے وہ مارے مارے پھریں گے، اس وقت ڈائرکٹر کرمانی اپنے گنجے سر پر ہاتھ پھیر کر، شراب کے چار پیگ پی کر اکیلا پلنگ پر سو جائے گا کوئی شخص اس سے یہ نہ پوچھے گا کہ تم نے کیوں اپنی راتوں کی نیند حرام کر کے اس دلکش صورت اور حسین جسم کی تخلیق کی۔ شاید تمھیں معلوم نہیں کہ ایڈیٹنگ روم میں بیٹھ کر قینچی کو پکڑ کر میں نے تمھارے ہر فریم کی نوک پلک سُدھاری ہے۔ آج اس تمام محنت کے عوض میں تم سے ایک رات کی بھیک مانگتا ہوں۔

کرمانی نے للچائی ہوئی نظروں سے پُشپا کی طرف دیکھا۔

"اگلی فلم کی ہیروئن تم ہی رہوگی" ___ کرمانی نے اپنی شکست کا اعتراف کرتے ہوئے کہا۔

رات کرمانی کے فلیٹ میں گزارنے کے بعد جب پُشپا اپنے فلیٹ میں پہنچی تو گورمکھ ناشتہ کر رہا تھا۔

"کہاں رہی تمام رات؟" گورمکھ نے تلخ لہجے میں پوچھا۔

"شوٹنگ کر رہی تھی۔"

"تیری فلم کی شوٹنگ تو کب کی ختم ہوگئی پُشپا؟"

"آخری شاٹ تھا۔"

"کیسا رہا؟"

پُشپا نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔ پھر وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولی۔ "سُننے کی ہمت ہے؟"

"میں تم سے صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں پشپا کہ تم نے جو کچھ حاصل کیا اس کی کتنی قیمت ادا کی تم نے؟"

"بہت بڑی قیمت! آج تیری بیوی طوائف بن گئی گورمکھ!" اتنا کہہ کر وہ اپنے بیڈروم کی طرف لپکی اور بیڈروم کا دروازہ زور سے بند کر دیا۔

اندر سے سسکیوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ گورمکھ نے وارڈروب سے شراب کی بوتل نکالی اور گلاس میں ڈال کر غٹاغٹ پینے لگا۔

وہ لڑکی

جب میں گھر سے باہر نکلا تو دن کے دو بج چکے تھے۔ دھوپ بیحد تیز تھی۔ بس اسٹاپ تک پہنچتے ہی میری قمیص کا کالر پسینے سے بھیگ گیا۔ میں نے جیب سے رومال نکال کر اپنی گردن سے پسینہ پونچھا۔ اور بس کا انتظار کرنے لگا۔ کیونکہ بہت کم لوگ تھے۔ بس کے آتے ہی میں سوار ہو گیا اور جو پہلی سیٹ نظر آئی اس پر بیٹھ گیا۔ گرمی کی وجہ سے بس میں ایک گھٹن سی تھی۔ لیکن بس کے چلتے ہی ہوا کا تیز جھونکا آیا، اور میں نے ذرا آرام کا سانس لیا۔ جب بھی میں بس میں بیٹھتا ہوں، تو دائیں بائیں یا آگے پیچھے ضرور دیکھتا ہوں تاکہ مجھے معلوم ہو جائے کہ میرے ساتھ کون صاحب اور کون صاحبہ تشریف فرما ہیں۔ جوں ہی میں نے دائیں والی قطار پر نظر پڑی تو میرا دل دھک سے رہ گیا۔ پھر اچانک مجھے محسوس ہوا، کہ میرے پیٹ میں کسی نے چھرا گھونپ دیا۔ میں نے ذرا سنبھلنے کی کوشش کی اور دائیں طرف پھر دیکھا تو میرا قیاس یقین کی حدوں کو چھو رہا تھا۔ "ہاں یہ تو وہی ہے" میں گومتی کو اس طرح اور اتنا عرصہ کے بعد بس میں دیکھ کر حیران رہ گیا۔ میں نے پھر جھک کر گومتی کی طرف دیکھا۔ گومتی کا آدھا چہرہ میری طرف تھا۔ اس کے ساتھ والی سیٹ خالی تھی۔ وہ جھکی ہوئی کھڑکی

سے باہر جھانک رہی تھی۔ میں اس آدھے جانے پہچانے چہرے کو پہچاننے کی کوشش کی، کہیں میں غلطی تو نہیں کر رہا تھا۔ کیا وہ گومتی ہی تھی۔ یا کوئی اور لڑکی؟ —— جو کچھ میں دیکھ سکا یا جو کچھ مجھے نظر آرہا تھا، اس سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا کہ یہ آدھا چہرہ گومتی کے سوا کسی اور کا نہیں ہو سکتا۔

ہاں وہی شفاف، نکھرا ہوا بے داغ چہرہ۔ شفاف جلد۔ صرف ایک رُخ، ایک ابرو، پلکوں کی ایک آراستہ صف، کالی سیاہ آنکھیں، رسیلے ہونٹ، ماتھے پر بکھری ہوئی ایک لٹ۔ اور گردن ذرا سی ایک طرف جھکی ہوئی۔ اور ایک کان میں لرزتا ہوا ایک بُندا۔

یہ سب کچھ دیکھ کر میں آپے سے باہر ہو گیا۔ آج سے چند سال پہلے میں یہ چہرہ اتنے قریب سے دیکھ چکا تھا کہ اسے دور سے دیکھنے کا خیال بھی ذہن میں نہ لا سکتا تھا۔ گومتی کی ساتھ والی سیٹ خالی تھی۔ میں نے سوچا، میں اپنی جگہ سے اُٹھ کر گومتی کے ساتھ بیٹھ جاؤں۔ میں اُٹھتے اُٹھتے پھر بیٹھ گیا۔ میں نے گومتی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے ایک شریر لڑکے کو دیکھا۔ وہ میری طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا، کیا وہ میری اضطراری کیفیت سے واقف ہو گیا تھا؟ اتنے میں ایک اسٹاپ پر بس رُکی۔ ایک ادھیڑ عُمر کی عورت گومتی کے ساتھ بیٹھ گئی۔ گومتی کا پورا چہرہ دیکھنے کی خواہش، اس طرح میرے دل میں کبھی نہ اُبھری تھی۔ اس چہرے کو میں نے کئی بار دیکھا تھا۔ میں کیوں چاہتا تھا کہ اپنی سیٹ پر سے اُٹھ کر آگے بڑھوں، اور پیچھے مڑ کر گومتی کے چہرے کو دیکھوں، اور اپنی ناقابلِ بیان پیاس بجھاؤں۔ میں ایک بچے کی طرح گومتی کو دیکھنے کے لئے بے قرار ہو گیا۔ اچانک مجھے کیا ہو گیا تھا۔ میرے ہاتھ سے ضبط کا دامن چھوٹنے لگا تھا۔ اگر میں اُٹھ کر آگے آگیا اور پھر پیچھے مُڑ کر دیکھا، اور پھر دیکھنے کے بعد اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ تو لوگ کیا کہیں گے؟ کیا وہ مجھے پاگل نہ سمجھیں گے؟۔

میں نے پھر اپنی گردن آگے بڑھا کر گومتی کی طرف دیکھا۔ گومتی کا چہرہ اُسی پوز میں تھا۔

وہی آدھا چہرہ۔ کیا وہ واقعی گومتی تھی؟ اور کون ہو سکتی ہے؟ اُس نے مجھے ضرور دیکھا ہو گا۔ میں جب بس میں سوار ہونے لگا تھا تو اسی کھڑکی کے قریب سے گزرا تھا۔ اس وقت گزرتے ہوئے اس نے مجھے دیکھا ہو گا، اور اس کے دل میں نفرت کا لاوا اُبل پڑا ہو گا۔

نفرت ——— میرے ذہن نے پانچ سال پہلے کی طرف زقند لگائی۔ جب ایک ڈرامے کی ریہرسل میں گومتی سے پہلی ملاقات ہوئی۔ پہلی ہی ملاقات میں وہ میری طرف کھنچ سی گئی۔ مجھے اس کا اندازہ ہو گیا تھا۔ شاید یہ میری خوش قسمتی تھی، اور گومتی کی بدقسمتی۔ دیکھنے میں گومتی بے حد خوبصورت تھی۔ خوبصورتی کے علاوہ وہ ایک ذہین لڑکی تھی۔ ذہانت اور خوبصورتی کا اتنا حسین امتزاج میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ جہاں تک اس کی سیرت کا تعلق ہے وہ آہستہ آہستہ مجھ پر آشکارا ہونے لگی۔ نہایت ٹھنڈے مزاج کی لڑکی تھی۔ متین اور بے حد باتونی۔ ہر شخص سے ہنس کر بات کرتی، اور مردوں سے بہت جلد بے تکلف ہو جاتی۔ اس لئے جس سوسائٹی میں وہ چلی جاتی ہر شخص اس کا گرویدہ ہو جاتا۔ کبھی کبھی وہ ہنستے ہنستے اچانک اداس ہو جاتی۔ ان اداس لمحوں میں وہ بیحد دلفریب، دلکش اور دل رُبا معلوم ہوئی۔ اس وقت یوں محسوس ہوتا جیسے ہم چلچلاتی دھوپ سے نکل کر سایہ دار درختوں کے تلے آ گئے ہیں، میں ان حسین لمحوں میں، اُس پر فریفتہ ہو گیا۔ لیکن میرے فریفتہ ہونے سے پہلے، وہ خود مجھے اپنے دل کی بستی میں بسا چکی تھی۔

میں بہت ہی خوش باش اور کھلنڈرا قسم کا انسان ہوں۔ نہ ماضی کی طرف دیکھتا ہوں نہ مستقبل کی طرف۔ اور جس حال میں ہوں، اس کے متعلق کبھی نہیں سوچتا۔ میں آج کی فکر کرتا ہوں۔ کل کی نہیں۔

میں صرف ایک دن کے لئے زندہ رہتا ہوں۔ کل کیا ہو گا، دیکھا جائے گا، میرا یہی لاابالی پن گومتی کو پسند آیا۔ اب ایک جھٹکے سے بس ایک اسٹاپ پر رُکی، اور میں نے بڑھ کر گومتی کی طرف دیکھا۔ وہ وہیں اسی حالت میں بیٹھی ہوئی کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔ اس

کا وہی آدھا چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے ایک بار بھی مُڑ کر نہیں دیکھا۔ شاید وہ میری طرف نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ ہاں پہلے پوز میں صرف ایک بات کا اضافہ تھا، کہ اس کا بایاں ہاتھ ٹھوڑی کو چھو رہا تھا۔ ہاتھ کی شفاف جلد، پانچ لمبی لمبی انگلیاں، بیحد صاف اور ستھرے ناخن، اور کلائی نہایت گوری گوری اور بھری ہوئی۔ کلائی پر کوئی زیور نہ تھا، کانچ کی چوڑی بھی نہ تھی۔ اب تو مجھے پورا یقین ہو گیا کہ یہ گومتی ہی ہے، یہ ہاتھ کسی اور کا نہیں ہو سکتا۔ اس نے اپنی کلائیوں میں آج تک کوئی زیور نہیں پہنا۔ شاید اسے زیورات سے نفرت تھی، اور اس وقت زیورات سے زیادہ مجھ سے نفرت تھی۔ جبھی تو وہ میری طرف نہیں دیکھتی۔ ہاں، اس کا غصّہ بجا تھا۔ میں اس کی نفرت کا مستحق تھا۔ مجھے وہ شام یاد آگئی۔ جب ہم سمندر کے کنارے ٹہل رہے تھے، اور سورج سمندر میں ڈوب چکا تھا۔ آسمان پر شفق کسی دوشیزہ کے آنچل کی طرح لہرا رہی تھی۔ اسی وقت گومتی نے اپنی محبت کا اظہار کر دیا۔ کہنے لگی:-

"تم میرے خدا ہو، میرے سب کچھ ہو، میرا سب کچھ تمھارا ہے۔"

اس کے شعلے کی طرح بھڑکتے ہوئے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ تڑپتے ہوئے مرتعش نتھنے دل کی وارفتگی عیاں کر رہے تھے۔ یہ سُن کر، اور دیکھ کر میں ہواؤں میں اُڑنے لگا۔ میں نے سوچا، میں یوسفِ ثانی ہوں، میں وہ عظیم فاتح ہوں جس نے شکست کا مُنہ کبھی نہیں دیکھا، میں نپولین ہوں، سکندرِ اعظم ہوں، اور گومتی میرے قدم چوم رہی ہے۔

اور میں ایک بے وقوف عاشق کی طرح اس کے حُسن و جمال سے کھیلتا رہا، اور اپنی طبیعت بہلاتا رہا۔ یہ سمجھ کر کہ وہ میری ہے اور ہمیشہ میری رہے گی، میں اس شرابی کی طرح دُنیا کو بھُول گیا، جو زیادہ شراب پی کر یہ سوچ لے کہ صُبح کبھی نہ ہوگی، اور یہ نشہ ابدی ہوگا۔

بس پھر رُک گئی۔

میرے خیالات کا سلسلہ رُک گیا، اور میری توجہ پھر گومتی کے چہرے پر آکر مرکوز

ہوگئی۔ ابھی تک وہ اسی طرح کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔ اس وقت تو دل چاہا کہ ایک بار اُٹھ کر گومتی کے پُورے چہرے کو دیکھ لوں۔ اس کے پورے چہرے کو دیکھنے کی تمنا اس طرح، اتنی تیزی سے، اتنی تندی سے کبھی نہ اُبھری تھی۔ میں نے اپنے آپ کو اتنا کبھی بے قابو نہ دیکھا تھا، اتنا بے بس، بالکل ایک بچّے کی طرح!

بس جلدی۔

میرے خیالات ماضی کی طرف اُڑنے لگے۔

تین سال تک گومتی نے میرا انتظار کیا، اور میں محبّت کے اَبدی نشے میں مست رہا۔ میں سمجھتا تھا کہ گومتی ہمیشہ کے لئے میری ہے۔

آپ سوچتے ہوں گے، یوں میں نے کیوں سوچا؟ یہ بھی آپ کو بتا دوں!

جب کوئی لڑکی کسی کو اپنا پرماتما بنالے تو اس انسان کی جو حالت ہوسکتی ہے، وہ بیان سے باہر ہے۔ میں جہاں، جس وقت جس جگہ بلایا، وہ آگئی۔ کوئی گلہ، شکایت، کوئی عذر اس نے پیش نہ کیا، جس سے میرے جذبات کو ٹھیس پہنچتی۔

ایک بار میں پونا چلا گیا، اور میں نے اسے پُونا بُلایا۔ وہ سیدھی پونا پہنچی، وہ دن مجھے یاد ہے، آسمان بادلوں سے گھرا ہوا تھا، اور ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی بہت ہلکی ہلکی پھوار! خیالوں کی طرح نازک!

اندر کمرے میں ہم دونوں بیٹھے ہوئے چائے پی رہے تھے۔

اچانک گومتی نے چائے کا پیالہ میز پر رکھ دیا، اور کہنے لگی:۔

"شیام اب مجھے یقین ہوگیا ہے کہ تم میرے نہیں ہوسکتے۔"

یہ کہہ کر اس نے اپنا سر نیچے کرلیا اور رونے لگی "میں کتنی بدقسمت ہوں" اس نے روتے ہوئے کہا۔ "تمھیں اپنا نہ بنا سکی، اس میں تمھارا کوئی دوش نہیں۔"

اور میں اندر ہی اندر ایک غبّارے کی طرح پھول رہا تھا۔ فخر و غرور نے میری

آنکھوں پر پٹی باندھ دی تھی۔ میں اس وقت کچھ نہ بولا۔ گومتی کے لفظوں سے محظوظ ہوتا رہا۔ اس کے الفاظ میری انانیت کو تقویت دے رہے تھے، میں اس دیوتا کی طرح تھا، جس کی پرستش کے لئے اس کے پجاری سرنگوں ہوں۔ اس دن گومتی بیحد اداس اور رنجیدہ تھی، میں باہر برآمدے میں آیا۔ بارش تیز تھی، اور ہوا میں ایک نشہ آور ٹھنڈک تھی۔ درختوں کے پتوں پر بارش کے قطرے لرزاں تھے، اور زمردیں گھاس پر لاکھوں کروڑوں آنسو تیر رہے تھے۔ میں اس وقت چاہتا تو بہت کچھ کر سکتا تھا لیکن میں اس وقت محبّت کی وادی میں چہل قدمی کرتا رہا۔ یہ سوچ کر کہ سارا راج میرا ہے، اور اس پر کبھی آفتاب غروب نہ ہوگا۔ پونا کی اس ملاقات کے بعد گومتی کبھی مجھ سے ملنے نہ آئی۔ میں سوچتا رہا کہ وہ مجھ سے ملنے آئے گی۔ لیکن وقت گزرتا گیا۔ گومتی نہ آئی۔ میں نے بہت سر مارا، لیکن محبت کی وادی میں شام ہو چکی تھی۔ گومتی نہ آئی۔

پانچ سال گزر گئے۔

میں گومتی کا انتظار کرتا رہا۔

دل کے نہاں خانے میں اُمّید کی قندیل جلاتا رہا۔ لیکن وہ نہ آئی۔ اور آج پانچ سال کے بعد میرے قریب اور مجھ سے بہت دور، اب آدھا چہرہ چھپائے ہوئے مجھ سے الگ تھلگ بیٹھی تھی۔ میرا چہرہ دیکھنا بھی پسند نہ کرتی تھی۔ میں نے بہت چاہا کہ اس کے سامنے اپنی شکست کا اعتراف کر لوں اور اس سے کہوں کہ اتنی بھی کیا نفرت؟

زندگی کتنی چھوٹی ہے۔ گومتی! آج تو موقعہ ہے بات کرنے کا۔ یہ کمبخت ساتھ والی عورت اُٹھ کر چلی جائے تو آج ہی اپنے دل کا حال کہہ دوں اور اپنے گناہوں کی معافی مانگ لوں۔ اور کہوں:۔

"مجھے معاف کرو گومتی! پچھلی باتوں کو بھول جاؤ۔ تاکہ میرے دل میں کوئی خلش نہ رہے، اور میں آرام اور راحت سے سو سکوں۔ میں نے سوچا تھا کہ میں تمھیں

بجھوا چکا ہوں۔ لیکن اس بھری دُنیا میں تنہا رہتے رہتے اب مجھے احساس ہو رہا ہے کہ تم ہی میری زندگی کا سہارا تھیں ۔ اب میرے پاس تمھاری پاکیزہ اور بے لوث محبت کے سوا کچھ نہیں رہ گیا۔ محبت کے راستے میں جتنی عورتیں مجھے ملیں، سب نے اپنی قیمت وصول کرلی ۔ ایک تم ہی ہو جس احسان کا بدلہ میں چکانا چاہتا ہوں ۔ نہ جانے میں ایسا کیوں نہ کرسکا. اور تمھیں ہمیشہ کے لئے اپنے ہاتھوں سے کھو دیا ۔ اور اب میں ساری دُنیا میں اکیلا مارا مارا پھرتا ہوں۔ میں اس بیکراں سمندر کی طرح ہوں جس کا کوئی ساحل نہیں ۔ میں اس آنکھ کی طرح ہوں جس میں کوئی آنسو نہیں میں اپنی تنہائی کے غار میں آکر بیٹھ جاتا ہوں ، اور مجھے اپنے زخموں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ شاید یہ زخم بھر جائیں۔ میں جانتا ہوں کہ وقت گزر جائے گا اور یہ غم بھی گزر جائے گا لیکن وہ نامناسب رویہ جو میں نے تمھارے بارے میں اختیار کیا تھا وہ فراموش نہ ہوگا، وہ مرتے دم تک میرے ساتھ رہے گا ۔ !

اتنے میں پھر بس رُکی ۔

اچانک مجھے یاد آیا کہ مجھے یہیں اُترنا تھا۔ میں نے سوچا، آخری بار گومتی کو اور دیکھ لوں ۔! میں اپنی جگہ سے اُٹھا ، میرے پیروں میں اُٹھنے کی سکت نہ تھی ۔ میری آنکھوں میں یہ منظر دیکھنے کی طاقت نہ تھی ۔ لیکن میں اپنی ساری طاقت کو یک جا کر کے اٹھا ، تاکہ گومتی کا پورا چہرہ اداس ، بے حد مغموم ، بے حد حسین چہرہ آخری بار دیکھ سکوں ۔

میں فوراً اپنی سیٹ سے اُٹھا ۔

آگے بڑھا ۔

اور پھر اس آدھے چہرہ پر جو اب پورا چہرہ تھا ۔ نگاہ ڈالی ۔

میرا دل دھک کرتے ہوئے پھر اپنی جگہ پر آکر رُک گیا ۔ ارے !

یہ گومتی نہ تھی ، یہ تو کوئی اور لڑکی تھی !

پاپ اور سزا

کھانڈیکر کو صرف اتنا یاد رہا کہ جب وہ تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا سڑک پار کرنے لگا تو اچانک ایک بھاری اور ٹرک کے نیچے آگیا تھا، اور اس کی بائیں ٹانگ بُری طرح کچلی گئی تھی۔ اگر اس کا سر اس ٹرک کے نیچے آجاتا تو وہ کب کا پرلوک سُدھار جاتا۔ شاید ابھی اس کی زندگی کے دن پورے نہیں ہوئے تھے۔ اس حادثے کے بعد جب اسے ہوش آیا تو وہ جنرل وارڈ میں تھے۔ اس کی بائیں ٹانگ پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ ڈاکٹروں نے اسے بتایا جب زخم بھر جائیں گے تو اس کی ٹانگ پر پلاسٹر لگایا جائے گا، اس کے بعد وہ چلنے پھرنے کے قابل ہوگا۔

اکیس دن تک وہ ہسپتال میں رہا۔ پلاسٹر لگوانے کے بعد وہ گھر پر آگیا۔ وہ ایک کھولی میں رہتا تھا۔ بیوی اور چار بچوں کے ساتھ۔ اس کمرے میں وہ اکیلا نہ تھا، تین خاندان اور تھے۔ تینوں مراٹھی۔ کھانڈیکر دراصل پونا کے ایک دور افتادہ گاؤں سے آیا تھا، وہیں اس نے شادی کی، وہیں جوتا گانٹھنے کا کام سیکھا۔ اس کا باپ بھی یہی کام کرتا تھا۔ باپ نے مرنے سے پہلے سلائی کا سُوا۔ ہتھوڑی، کیلیں، بُرش اور اس طرح کی

اور دو چار چیزیں اس کے حوالے کیں۔ یہی سرمایۂ حیات تھا اس کے باپ کا۔ ماں تو بچپن میں مرگئی تھی، اس کی صورت سے بھی وہ نا آشنا تھا۔

گاؤں میں بہت کم لوگ جوتا پہنتے تھے۔ اکثر لوگ تو ننگے پاؤں ہی گھوما کرتے تھے۔ مہنگائی اتنی بڑھ گئی تھی کہ لوگ جوتے خریدنے کی بجائے راشن خرید لیتے۔ شروع میں جتنا کماتا، اس سے گھر بار کا خرچہ چل جاتا۔ جونہی ایک بچہ ہوا اس کے اخراجات بھی بڑھے۔ جب دوسرا ہوا، تو اس گاؤں میں دو وقت کی روٹی کا ملنا بھی مشکل ہوگیا۔ اس لئے کھانڈیکر نے بمبئی کا رُخ کیا اور اس بڑی پتھروں والی بلڈنگ کے بڑے اندھیرے میں سات روپیہ ماہوار پر اس چھوٹے سے پریوار کو رہنے سہنے اور کھانے پکانے کی جگہ مل گئی۔

یہاں آتے ہی اس کی اچھی خاصی آمدنی ہوگئی۔ اتنی آمدنی تو نہیں تھی کہ وہ کچھ بچا سکتا۔ پھر بھی اتنے روپے کما لیتا کہ پورے خاندان کو دو وقت کا کھانا نصیب ہو جاتا۔

کھانڈیکر کام کاج کرنے میں کافی چاق و چوبند تھا۔ اسے یقین تھا کہ جب تک اس کے بازوؤں میں طاقت ہے، وہ محنت مزدوری کر سکتا ہے، اور جب وہ بوڑھا ہو جائے گا تو اس کے بیٹے کمانے کے قابل ہو جائیں گے۔

اس حادثے سے پہلے وہ چار بچوں کا باپ تھا۔ پرماتما کی مہربانی صرف اتنی ہی تھی کہ اس کی بیوی نے چاروں لڑکے ہی جنے تھے۔ اگر کوئی لڑکی ہو جاتی تو اس کے جہیز کے لئے روپے کہاں سے آتے۔ پرماتما بچوں کی بارش غریبوں پر زیادہ کرتا ہے، امیروں پر کم۔ اس لئے غریبوں کو پرماتما پہ زیادہ اعتماد رہتا ہے۔ .....

اس حادثے نے اسے کافی کمزور کر دیا۔ ڈاکٹروں نے چلنے پھرنے سے منع کر دیا تھا۔ گھر میں کوئی اور کمانے والا نہ تھا۔ اس کی بیوی کو سوائے روٹی پکانے کے اور

کوئی کام نہیں آتا تھا۔ بچاری کھانا بھی پکائے، گھر کو بھی سنبھالے، اور اب تو خاوند کی تیمارداری بھی کرنا پڑتی تھی۔ بیمار خاوند کو دوائیاں اور اچھا کھانا چاہیئے۔ گھر میں کوئی اور کمانے کے لائق نہ تھا۔ گھر میں جو تیس بتیس روپے تھے، وہ چند دنوں میں دوائیوں کی نذر ہو گئے۔ کم سے کم دو وقت کا کھانا تو ملنا چاہیئے، ورنہ انسان زندہ کیسے رہے؟ محض دو وقت کا کھانا کھانے کے لئے اس کی بیوی منوا نے فٹ پاتھ پر گلے سڑے پھل اور ترکاریاں بیچنی شروع کر دیں۔ منڈی میں جا کر وہ کچے، پکے کیلے، ٹماٹر، بھنڈی، آلو اور توری خرید کر لاتی، اور ایک گندا میلا سا کپڑا فٹ پاتھ پر بچھا کر ان ترکاریوں اور کیلوں کو بیچتی۔ راہ گیروں کو کھانے اور پکانے کے لئے سستے داموں چیزیں مل جاتیں، جو کچھ بچ جاتا، منوا اسے غنیمت سمجھتی۔ بے چاری ان حالات میں اور کیا کر سکتی تھی۔

اس گندی کال کوٹھری میں رہ کر ان چھ افراد کے کُنبے کو کچھ معلوم ہی نہ تھا کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ ہندوستان کب آزاد ہوا؟ اس تقسیم کب ہوئی؟ نہرو جی کب مرے، اور شاستری جی کی موت کیسے ہوئی؟ اور نہرو جی کی بیٹی کیوں راج کر رہی ہے دیس میں مہنگائی کیوں بڑھ گئی ہے؟ ہم اس دیس میں کیوں پیدا ہوئے، کسی اور ملک میں پیدا ہوتے تو کیا ہوتا؟ کیا انسان اپنے ملک کی قسمت بدل سکتا ہے۔؟ کیا غریبوں کو دو وقت کا کھانا مل سکتا ہے؟ سوشلسٹ پیٹرن آف سوسائٹی، کسے کہتے ہیں۔ ویلفیر ریاست کا کیا مطلب ہے؟ کھانڈے کر نہ اخبار پڑھ سکتا تھا، نہ اس نے کبھی یہ پوچھنے کی کوشش کی کہ ان اخباروں میں کیا لکھا ہے، اور ان کے پڑھنے اور چھپنے سے کیا فائدہ ہے؟ وہ تو صرف یہ جانتا تھا کہ جس قسم کی زندگی وہ گزار رہا تھا وہ محض اس کے پچھلے جنم کے کرموں کا نتیجہ تھی۔ اور جو پاپ اس نے اس جنم میں کئے ہیں اس کی سزا اس کو اگلے جنم میں ملے گی۔ کھانڈ بکر لیٹے ہوئے یہ سوچتا رہا، اس جنم میں ابھی تک اس نے کوئی پاپ نہیں کیا۔ اگلے جنم میں اسے کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ پیٹ بھر کھانا ملے گا۔ جب کبھی وہ بیمار ہوگا

تو ڈاکٹر علاج کے لئے اس کے گھر پر آئے گا، رہنے کے لئے اچھا مکان ملے گا۔ اس کی بیوی اور بچّے خوبصورت کپڑے پہن سکیں گے۔

دراصل روزمرّہ کی جدوجہد اتنی سخت تھی کہ اسے سوچنے اور سمجھنے کا موقع ہی نہ ملا۔ کبھی کبھار کسی تہوار کے موقع پر باہر سے چند لوگ گانے کے لئے بُلوائے جاتے۔ یہ گوییّے بھی دور افتادہ گاؤں سے آتے۔ ہارمونیم اور طبلے کی تھاپ پر وہ اپنی بھدّی اور بے سُری آوازمیں بھجن گاتے۔ یہ بے ہنگم آوازیں، شور و غُل سب کو اچھا لگتا۔ ساری رات گوییّے گاتے رہتے اور چال کے سب لوگ ان گیتوں کو سُنتے۔ کبھی کبھی منوا دروازے کی اوٹ سے اس کی طرف دیکھتی اور مُسکرا کر پیچھے ہٹ جاتی۔ منوا کی مُسکراہٹ اسے بہت اچھی لگتی، نہ جانے کیوں.....؟

لیٹے لیٹے وہ تنگ آگیا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ جلد از جلد تندرست ہو جائے تاکہ وہ کام کاج کر سکے۔ بیچاری منوا گھر کا بھی کام کرے، بچّوں کو بھی سنبھالے اور کمائے بھی۔! کب تک منوا اسی طرح گھر کا کام کرتی رہے گی؟۔

جوں جوں دن گزرنے لگے، وہ اور دُبلا ہو گیا۔ پھر بخار اور کھانسی نے زور پکڑا۔ ڈاکٹر کو دکھایا تو پتہ لگا کہ بُرا روگ ہو گیا ہے۔ انجکشن لکھ دیئے، اور دوسری دوائیں بتائیں، ساتھ ہی منوا سے کہا۔ "اسے وٹامن، دودھ، پھل اور تازہ ہوا کی سخت ضرورت ہے"۔

ان سب چیزوں کے لئے روپے چاہئیں، اتنے روپے کہاں سے آتے؟ بڑی مشکل سے دو وقت کا کھانا ملتا تھا، اور کھولی کا کرایہ ادا ہو جاتا تھا۔ دن بدن وزن گھٹنے لگا۔ بیماری بڑھنے لگی۔ اس نے ایک بار اُٹھنے کی کوشش کی فوراً مُنہ کے بل گر پڑا۔ منوا نے اسے سہارا دیا۔

"کب تک سہارا دوگی منوا؟"

"جب تک جسم میں جان ہے؟"

"منوا، اب اس دُنیا میں رہنے کو جی نہیں چاہتا، تم کب تک محنت مزدوری کرتی رہوگی، میں تو اب بالکل بوجھ بن گیا ہوں۔"

"فکر نہ کرو، جب اچھے ہو جاؤ گے تو پھر کمانا!

"نہیں منوا، میرا دل کہتا ہے، یہ بیماری میرا پیچھا نہیں چھوڑے گی، اس بیماری کا کوئی علاج نہیں منوا۔ اب پرماتما مجھے اس دھرتی سے اٹھا لے تو....."

"یہ نہ کہو..... نہ نہ..... ایسی باتیں نہ کرو پرماتما کے لئے ایسی باتیں مت کہو!"

یہ کہہ کر منوا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

کھانڈ بکر کو یقین ہو گیا تھا کہ اب وہ بچ نہیں سکے گا۔ شاید مرنے والے کو اپنی موت کا پتہ چل جاتا ہے۔ اب تو بڑا بیٹا بھی اس سے آکر پوچھتا:

"بابا، تم کام پر کب جاؤ گے؟"

"جلدی جاؤں گا بیٹا!"

"بابا، میں نے کتنے دنوں سے میٹھی گولیاں نہیں کھائیں۔"

"اچھا ہو جاؤں تو لا کر دوں گا۔"

اتنے میں دوسرا لڑکا آکر کہتا" بابا تم ہر وقت کیوں لیٹے رہتے ہو؟"

دراصل بچے بھی حیران تھے کہ بابا کو کیا ہو گیا ہے، وہ گھر میں کیوں لیٹا رہتا ہے، باقی بچوں کے باپ تو روز کام پر جاتے ہیں، انھیں کے بابا کام پر نہیں جاتے' ان کی زندگی میں خوشی کے لمحات کیوں نہیں آتے۔ وہ برف کا گولا نہیں کھا سکتے۔ کھلونا نہیں خرید سکتے، جھولے پر نہیں بیٹھ سکتے۔

کھانڈ بکر نے آج رات محسوس کیا کہ جیسے یہ اس کی زندگی کی آخری رات تھی۔ وہ چاروں بچوں کو اپنے ساتھ سُلانا چاہتا تھا۔ ڈاکٹر نے منع کیا تھا کہ کوئی بچہ باپ کے ساتھ نہ سوئے، اس کا جھوٹا کھانا نہ کھائے، اس کے برتن استعمال نہ کرے، نہیں تو

بچوں کو بھی ٹی۔ بی ہو جائے گی۔

رات کیسے کٹی، اس کا اندازہ کھانڈیکر ہی کو تھا۔ صبح ہوتے ہی اس نے اپنے آپ کو بہت کمزور پایا۔ بڑی مشکل سے وہ سانس لے رہا تھا، اور کھانسی نے اتنا زور پکڑا کہ پسلیوں میں درد ہونے لگا۔ اس نے اپنے جسم پر نگاہ ڈالی۔ بس ہڈیوں کا ڈھانچہ ہو کر رہ گیا تھا۔

اب تو سب کے چہرے دُھندلے نظر آنے لگے، وہ اپنے بچوں کو قریب بُلانا چاہتا تھا۔ آخری بار ان کی صورت دیکھ لے۔ وہ منوا سے کہنا چاہتا تھا: "پگلی! میں تمھارے پیار کا صلہ بھی نہ دے سکا۔ میں تو پچھلے جنم کے پاپوں کی سزا بھگتنے آیا تھا۔ تو نے کیوں میرا ساتھ دیا۔ اب اگلے جنم میں..... اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔

کیا مرنے سے پہلے لوگ روتے ہیں؟ اب آنکھوں کی بینائی کم ہو رہی تھی، دل بیٹھ رہا تھا، کمزوری اور بڑھ رہی تھی، وہ اپنا ہاتھ نہیں ہلا سکتا تھا۔ اس نے بڑی ہمت کر کے چاروں طرف دیکھا۔ اس کے سرہانے اس کا چھ سال کا لڑکا کھڑا تھا، اس کے ہاتھ میں بوٹ اور پالش کی ڈبیا تھی۔

"بابا! اب تم کام پر نہ جانا۔ آج سے میں کام پر جاؤں گا۔" اس کی آنکھیں بند ہو رہی تھیں، اس کے کان بند ہو رہے تھے، لیکن ذہن ابھی تک مردہ نہیں ہوا تھا۔

"میں نے پچھلے جنم کی سزا بھگت لی، اب تیری باری ہے بیٹے!"

اس کا دل ڈوبنے لگا — ایک ہچکی آئی اور — اس کا سر لڑھک گیا۔

اس کا بڑا لڑکا باہر فٹ پاتھ پر بیٹھا ایک آدمی کے جوتے پر پالش کر رہا تھا۔

میرے زخم

دراصل میں خود حیران تھا کہ مجھے کیا ہوگیا ہے۔ ارملا کو دیکھنے کے بعد میری آواز
کیوں حلق میں اٹک جاتی ہے ۔ جو وہ کہتی ہے ، اسے کرنے پر میں کیوں مجبور ہو جاتا ہوں ،
ارملا کو میرے گھر آئے ہوئے صرف چند دن ہوئے تھے ، وہ اپنی پھوپھی کے ساتھ آئی تھی
اگر میں اپنے خدوخال کا نقشہ آپ کے سامنے کھینچ دوں تو مجھے سمجھنے میں آپ کو بہت
آسانی ہوگی ۔

میری صورت دیکھ کر آپ کبھی خوش نہ ہوں گے ۔ یعنی اچھا خاصہ بدصورت آدمی
ہوں ۔ یوں میرے بتیس دانت اپنی جگہ پر ہیں ، ناک ذرا لمبی اور نوکدار ہے ۔ لیکن
اتنی لمبی اور نوکیلی نہیں کہ آپ میرا مذاق اڑاتے پھریں ۔ آنکھیں نہ چھوٹی ہیں ، نہ بڑی ۔ چہرہ
لمبوترہ ۔ رنگ ذرا سیاہ سا ۔ ماتھا چھوٹا اور بال کالے کم ، سفید زیادہ ۔ یوں میری
عمر زیادہ نہیں ہے ، بلکہ اسے خاندانی بیماری سمجھئے کہ میرے بال کم عمر میں ہی سفید ہوگئے ۔
یوں چہرے کو دیکھ کر آپ کبھی یہ نہیں کہیں گے کہ کوئی چیز اپنی جگہ پر نہیں ہے ، لیکن
مجموعی طور پر میرا چہرہ خوشگوار اثر نہیں ڈالتا ۔ یوں میرا قد لانبا اور اچھا خاصہ ڈیل ہے ،

بھاری آواز۔ پھر بھی کیا عرض کروں کہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی بات نہیں بنتی۔

اس بات کا مجھے علم ہے کہ میرے پیدا ہوتے ہی میری ماں مرگئی تھی اور میرے باپ نے دوسری شادی کرلی۔ میرا باپ ایک حولدار تھا اسے سوائے حکم چلانے کے اور کچھ نہ آتا تھا۔ بچپن میں اس نے مجھے خوب مارا۔ اس لئے پانچویں جماعت سے آگے نہ پڑھ سکا۔ جب میں جوان ہوا تو سارے علاقے میں اچھا خاصا آوارہ گرد مشہور ہوچکا تھا۔

چند لوگ اچھے کام کرکے مقبول اور مشہور ہوجاتے ہیں۔ میں نے بُرے کام کرکے شہرت حاصل کرلی تھی۔ یہ بات تو نہیں کہ میں شرابی کبابی یا جواری تھا، بس کام نہ کرنے کی ایسی عادت سی پڑگئی تھی کہ بہت کوشش کرنے پر بھی یہ عادت مجھ سے نہ چھوٹ سکی تھی۔ ذاتی مشغلہ یہ رہ گیا کہ یار دوستوں سے یا تو گپّیں ہانکنا۔ چار مینار کے مسلسل سگرٹ پینا۔ گھٹیا ناول اور افسانے پڑھنا۔ نت نئی فلمیں دیکھنا، اور ان سے جہلت ملتی تو ایک ہلکی پھلکی کہانی گھسیٹ لینا۔ ایک اور بُری عادت پڑگئی تھی، جسے کہتے ہوئے شرم سی آتی ہے۔ یعنی جب میں کسی خوبصورت لڑکی کی طرف دیکھتا تو بس دیکھتا ہی رہ جاتا۔ حتیٰ کہ لڑکی آنکھوں سے اوجھل ہوجاتی اور میں خوابوں کی دُنیا میں کھو جاتا۔

میری بدصورتی مجھ پر اس قدر غالب تھی کہ آج تک کسی لڑکی نے مجھ سے مُسکرا کر بات نہ کی اکثر جوان لڑکیاں مجھے دیکھ کر منہ پھیر لیتیں۔ یوں مرنجان مرنج قسم کا آدمی ہوں نہیں۔ اپنا کام نکالنا جانتا ہوں۔ کافی بیباک اور اکھڑ مزاج ہوں۔ جب تک لوگ میری مدد کرتے ہیں، میں ان کی طرفداری کرتا ہوں، جونہی وہ مدد کرنے سے انکار کرتے ہیں؛ میں بھی ان سے مُنھ پھیر لیتا ہوں۔ کبھی ملاقات ہوجائے تو ان کی اچھی خاصی خبر لیتا ہوں۔ چھوٹے بھائیوں سے روپے اُدھار لے کر انھیں کبھی واپس نہیں کرتا۔ اپنے گھٹیاپن کا مجھے احساس ہے۔ کیا کروں زندگی کی گاڑی اس گھٹیاپن کے بغیر نہیں چلتی، اور اس وجہ سے لوگ مجھ سے دور بھاگتے ہیں۔

ایسی حالت میں اُرملا نے میری طرف دیکھا۔ دیکھتے ہی میرا دل دھک سے رہ گیا۔ یوں اُرملا تھی لڑکی۔ ایسی لڑکی نہیں جسے انسان دیکھتے ہی اس پر فدا ہو جائے۔ میری طرح وہ اچھی خاصی بدصورت تھی۔ جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ میرے چہرے پر وہ اعضا تھے جو ایک خوبصورت انسان کے چہرے پر ہوتے ہیں۔ لیکن مجموعی طور پر ایسا تاثر پیدا کرتے کہ دیکھتے ہی گھن آنے لگتی۔ اُرملا کے چہرے کی بھی یہی حالت تھی۔ اُرملا کی آنکھیں بالکل ٹھیک تھیں، نہ ٹیڑھی نہ بھینگی۔ سر کے بال سیاہ تھے ناک مجھ سے بہتر۔ ہونٹ ذرا موٹے موٹے اور رنگ مجھ سے زیادہ سیاہ، چہرہ بھرا ہوا۔ جہاں تک اُرملا کے جسم کا تعلق تھا، اس میں نسوانی دلکشی کی جھلک نمایاں تھی، لیکن اگر مجموعی طور پر اُرملا پر تنقیدی نظر ڈالی جائے تو اسے اچھی خاصی بدصورت لڑکیوں کی صف میں جگہ ملے گی۔

پہلی ملاقات میں اُرملا نے بُلا کر کہا:۔

"یہ لو پانچ کا نوٹ، اور فلم جنگلی کے دو ٹکٹ لاؤ! جلدی!"

اُرملا کے اندازِ بیان میں کوئی نسائیت نہیں تھی، بلکہ بات کہنے کا ڈھنگ ہٹلرانہ تھا، جو مجھے ناگوار لگا۔ میں اس وقت خاموش رہا۔ اگر اس طریقے سے میرا کوئی ساتھی مجھ سے ہمکلام ہوتا تو پانچ روپے کا نوٹ اس کے مُنہ پر دے مارتا۔ میں نے سوچا کسی لڑکی کی اس طرح بے عزّتی کرنا شرافت نہیں حماقت ہوگی۔ میں نے ٹکٹ خرید کر اُرملا کو دے دیئے۔ اس نے شکریہ بھی ادا نہ کیا۔ بس ٹکٹ مجھ سے چھین لیے۔ کیا میں اُرملا کا زرخرید غلام تھا۔ کیا سمجھتی ہے وہ اپنے آپ کو؟ شاید وہ یہ نہیں جانتی کہ میں کس قسم کا آدمی ہوں۔ اجی جس نے اپنوں سے بگاڑلی، وہ دوسروں کی کیا پرواکرے گا۔

اگلے دن وہ کہنے لگی — "ذرا ماچس لا دیجئے بازار سے۔" اور میں ماچس لے آیا۔ پھر کہنے لگی۔ "چائے کا پیکٹ؟" وہ بھی لے آیا۔ پھر سوئی اور دھاگے کی فرمائش کر دی ایک دن تو غضب کر دیا اُرملا نے۔ کہنے لگی۔ "وہ سلیپر اٹھا کر لائیے۔" کوئی اور ہوتا تو سلیپر

اٹھاکر منہ پر مارتا۔ میں نے خاموشی سے سلیپر اٹھاکراس کے پاؤں کے پاس رکھ دیئے۔
میری خودداری و عزت کہاں گئی تھی، شرم سے میرا سر جھک گیا۔ میں نے بے شرمی کا لبادہ
کیوں اوڑھ لیا؟ میں ارملا سے صاف صاف کیوں نہیں کہہ دیتا کہ تم مجھے کیا سمجھتی ہو، اتنے
گھٹیا کام مجھ سے کیوں کرواتی ہو؟۔ اور سچ بات تو یہ ہے کہ مجھے اپنے آپ سے پوچھنا
چاہیئے، کہ میں ایسے گھٹیا کام کرتا ہی کیوں ہوں؟۔

ارملا دس دن تک میرے گھر میں رہی، اور دس دنوں تک مجھ پر ایک طرح
کی ڈکٹیٹر کی طرح حکومت کرتی رہی اور میں ایک غلام کی طرح اس کے حکم کی تعمیل کرتا رہا۔
گیارہویں دن جب وہ جانے لگی، تو اس نے میری طرف دیکھا۔ اُن آنکھوں میں ایک
عجیب قسم کی رعونت اور اکھڑپن تھا۔ ان آنکھوں میں کسی قسم کی نرمی نہ تھی۔ نہ شفقت نہ پیار
اور نہ ہی محبت کی کوئی ایسی خوشبو جس سے میرا دماغ معطر ہو جاتا۔ وہ آنکھیں اصرار کے
انداز سے کہہ رہی تھیں۔ ”جہاں میں جا رہی ہوں، وہاں تمھیں آنا پڑے گا!“ عجیب
معشوقہ سے پالا پڑا ہے۔ خالص ڈکٹیٹر ہے کم بخت۔ میں دو سال تک اپنے گاؤں میں
بھٹکتا رہا، تاکہ اسے اپنے دل سے بھلا سکوں!۔

ارملا نے مجھے کیا دیا تھا کہ میں اسے یاد کرتا۔ بس نوکروں کی طرح کام لیتی رہی
وہ کونسی کافرادا حسینہ تھی کہ میری نظروں سے اوجھل نہیں ہو سکتی۔ مجھے غصہ تو اس کا
تھا کہ میں غلاموں کی طرح اس کے حکم کو بجا لاتا رہا۔ آخر کیوں؟ — دو سال تک میں
اور کوئی کام نہیں کر سکا۔ بس ارملا کے خلاف ایک محاذ بناتا رہا۔ مل جائے تو اس
بے عزتی کا بدلہ لوں گا۔ یہی سوچتے سوچتے میرا دماغ شل ہو گیا۔ یہ کس قسم کا غصہ اور
نفرت تھی مجھے ارملا سے .... اور کیوں؟ ..... میں ارملا کو بھول کیوں نہیں جاتا؟ اس
ذہنی انتشار سے مجھے کیا ملے گا اسے بے عزت کر کے مجھے کونسا تمغہ ملنے والا ہے۔
ارملا کا بدصورت چہرہ بار بار میری آنکھوں کے سامنے آتا۔ پھولے ہوئے نتھنے سیاہ

چہرے پر موٹے موٹے ہونٹ، بیکار سی رعونت۔ طرزِ تکلم ہٹلرانہ! کیا یہ نفرت کا لاوا محبت کو جنم دے رہا تھا؟ کیا نفرت کی کوکھ سے محبت پیدا ہوتی ہے؟۔ میں پہلے بیکار تھا، اُرملا کی محبت نے اور بے کار کر دیا۔ میں چڑ چڑا سا ہو گیا۔ بات بات پر یار دوستوں سے لڑ پڑتا جو لوگ میرے ہمدرد تھے، ان سے بھی جھگڑا کرتا۔ اور جب میں اس گاؤں میں بالکل اکیلا رہ گیا۔ تو میں نے اُرملا کے شہر کی طرف کا رُخ کیا، تا کہ میری روح کی تشنگی مٹ سکے۔

میں بمبئی آ گیا جہاں اُرملا اپنے بھائی اور بھاوج کے ساتھ رہ رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس کا چہرہ دمک اٹھا، پیشانی پر فتحمندی کے آثار نمودار ہو گئے۔ کہنے لگی "مجھے یقین تھا، تم آؤ گے!"

یہ میری زندگی کا بدترین دور تھا۔ آٹھ سال کا عرصہ ایک بھکاری کی طرح اس شہر میں گزار دیا۔ پانچویں جماعت پاس انسان بھلا اس شہر میں کیا کر سکتا تھا، بس تھوڑی سی ہندی آتی اور ٹوٹی پھوٹی انگلش۔ کام کاج کے لئے کافی ہاتھ پاؤں مارے، مگر نتیجہ صفر نکلا۔ ایک وقت کھانا کھا کے سو جاتا۔ بس انھیں دنوں اُرملا میرے کام آئی۔ وہ اکثر مجھ پر ترس کھا کر مجھے ایک دو روپے دے دیتی، کبھی کبھار میرے کپڑے دھوتی۔ قمیض یا پاجامہ پھٹ جاتا تو فوراً اسے سی دیتی، اور مہینے میں ایک، دو فلمیں بھی دکھا دیتی اور ہمیشہ مجھ سے کہتی۔ "کوئی کام کرو۔" جب کوئی اور کام نہ ملا تو میں نے دادر پوسٹ آفس کے باہر منی آرڈر لکھنے کا کام شروع کیا، چلچلاتی دھوپ میں کھڑا ہو کر لوگوں کے منی آرڈر لکھتا۔ برسات میں جب بارش ہوتی تو پوسٹ آفس کی دیوار سے لگ کر تار اور منی آرڈر لکھتا ـــــ یہ کیسے دن تھے؟ یہ کیسی راتیں تھیں۔ یہاں تو کوئی کسی کا نہ تھا۔ بس ایک اُرملا تھی، جو وقت بے وقت دو میٹھے بول بولتی۔ اب تو حکم نہ ماننے کی ہمت بھی مجھ میں نہ رہی تھی۔ اب مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ ارملا کے ظاہری خول میں ایک تکبر، غرور اور رعونت ضرور تھی لیکن اس کے دل کے اندر میرے لئے کافی جگہ تھی۔ اگر اسے مجھ سے ہمدردی نہ کرتی تو وہ میرے کپڑے ہرگز نہ

دھوتی۔ ان پرا سر سی نہ کرتی۔ میرے پھٹے ہوئے کپڑوں کو اسے سینے کی کیا ضرورت تھی ؟ اور اسے کہنے کی کیا ضرورت تھی کہ "کہیں نوکری کر لو!" جب کبھی وہ نوکری کی بات کرتی، تو میرے تن بدن میں آگ لگ جاتی۔ نہ جانے میرا جی ایک جگہ جم کے کام کرنے کو کیوں نہیں چاہتا؟ اگر مجھے نوکری مل جائے تو میں ایک کمرہ کرائے پر لے سکتا ہوں۔ اُرملا میرے پاس رہ سکتی ہے۔ جو کچھ میں کماتا تھا، اس سے صرف دو وقت کا کھانا ہی کھا سکتا تھا۔

اُرملا کے بھائی کو ہم دونوں کی ملاقاتوں کا پتہ چل گیا۔ بس پھر کیا تھا، وہ اپنی بہن پر ایسا برسا کہ ناکوں چنے چبوا دیئے۔ ایک رات اُرملا کو اتنا پیٹا کہ وہ سات دنوں تک گھر سے باہر نہ نکل سکی۔ بھائی نے بہن سے صاف صاف کہہ دیا:۔

"اگر تم نے اس ناخلف۔ بے شرم، آوارہ، اور بے کار انسان سے بات کی تو میں تمھاری ہڈی پسلی ایک کردوں گا۔ اگر وہ کبھی یہاں آیا تو اس کی لاش ہی یہاں سے جائے گی!"

جب مجھے اس مار پیٹ کی خبر ملی تو بے حد رنج ہوا۔ کتنا بے کار قسم کا آدمی ہوں کہ اُرملا کو اپنانے کے لئے کچھ کرتا نہیں۔ چند دنوں کے بعد پتہ چلا کہ اُرملا کی سگائی ہونے والی ہے۔ اس خبر کے ملتے ہی میرے ہوش اُڑ گئے۔ اب میں کہاں جاؤں، کیا کروں، کس سے کہوں: اپنے دل کی واردات۔ میری کون دیکھ بھال کرے گا۔ اس دُنیا میں اُرملا کے سوا میرا اور کون ہے؟ مجھے ایک دو روپے روز کون دے گا؟ میرے میلے کپڑے کون دھوئے گا؟ میرے پھٹے کپڑوں کو کون سئے گا۔؟ مجھے ڈھارس کون دے گا، مجھ سے کون کہے گا کہ "تم نوکر کیوں نہیں ہو جاتے؟" مجھ سے کون بات کرے گا، اب میں کہیں کا نہ رہا۔ اُرملا کے بغیر میری زندگی بے کار تھی۔ میں اُرملا سے ضرور ملوں گا۔ اور کہونگا۔ اگر تم نے کسی اور سے شادی کرلی تو میں بالکل بے سہارا ہو جاؤں گا۔" میں اُرملا کے گھر کی طرف چل دیا۔ آج اگر اُرملا کے گھر سے میری لاش نکلتی ہے تو نکلے۔ اس کا بھائی مجھے قتل

کرنا چاہتا ہے تو قتل کرے۔ اب تو مرنا ہی بہتر ہے۔

سورج غروب ہو رہا تھا۔ وہ شام مجھے ابھی تک یاد ہے، وہ شام میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ اس قسم کی شام زندگی میں صرف ایک بار آتی ہے۔ جونہی اُرملا کے گھر کے قریب پہنچا کہ سامنے سے اُرملا آتی ہوئی دکھائی دی۔ وہ میرے قریب سے گزری، اس نے میری طرف نہیں دیکھا۔ میں اس کے پیچھے ہو لیا۔ بازار سے نکل کر ہم دونوں ایک جنگلے کے قریب آ گئے۔ جنگلے کے ساتھ ریل کی پٹڑی تھی۔

"جانتے ہو میری سگائی ہو رہی ہے؟"

"ہاں!"

"اب تو میری زندگی کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ اب ملنے سے کیا فائدہ؟"

"یہ فیصلہ تمھارے بھائی نے کیا ہے، میں اپنی قسمت کا فیصلہ تمھاری زبان سے سُننا چاہتا ہوں!"

میں نے چار مینار کا پیکٹ جیب سے نکالا اور ایک سگرٹ سُلگایا۔

"آٹھ سال سے دیکھ رہی ہوں کہ تم ایک راستے پر چلے جا رہے ہو!"

"اور وہ راستہ تمھارے گھر کی طرف جاتا ہے۔" میں نے زور سے سگرٹ کا کش لگاتے ہوئے کہا۔

"اور، وہ راستہ اب بند ہو چکا ہے، مجھے اب شادی کرنی ہوگی، میرے لئے اور کوئی راستہ نہیں!"

میں نے غصّے میں آ کر جلتے ہوئے سگرٹ کو ہتھیلی کی بائیں طرف بجھایا۔ اُرملا نے جلتے ہوئے سگرٹ کو بجھتے ہوئے دیکھا۔ میرے بائیں ہاتھ کی چمڑی جل رہی تھی۔

میں نے سوچا تھا "ان آٹھ برسوں میں تم کچھ کر لو گے۔"

"اور میں کچھ نہ کر سکا"

"میں نے چاہا تھا کہ تم کہیں نوکر ہو جاؤ ـــــ ایک کمرہ کرایہ پر لے لو۔ پھر میں اپنے بھائی سے .....

"میں ایک کمرہ بھی نہ لے سکا!"

میں نے دوسرا سگریٹ ہتھیلی کی بائیں طرف بجھاتے ہوئے کہا۔ دو زخم ہو گئے تھے۔ میرے ہاتھ کی جلد جل رہی تھی۔

میں نے یوں بھی سوچا کہ "تم ہمیشہ کے لئے بھول جاؤ گے، اور گھر واپس چلے جاؤ گے!"

"اور میں تمہیں آج تک نہ بھلا سکا" میں نے تیسری سگرٹ کو ہتھیلی کی بیک پر بجھاتے ہوئے کہا!

"میں نے سوچا تم خودکشی کر لو گے!"

"اور میں خودکشی بھی نہ کر سکا"

میں نے اپنا چوتھا اور پانچواں سگرٹ اپنے بائیں ہاتھ کی ہتھیلی کی بیک پر بجھاتے ہوئے کہا:

میرے ہاتھ کی چمڑی جل رہی تھی۔ پانچ جلتے ہوئے نشان، میرا سارا جسم کانپ رہا تھا۔ میں نے ایک لمحہ اپنے ہاتھ کی طرف دیکھا، ایک اور سگرٹ سلگایا۔!

"یہ کیا کر رہے ہو؟" وہ چلا کر بولی "کیوں جلا رہے ہو اپنے آپ کو؟"

"تم ہاتھ کی بات کر رہی ہو۔ آج میں اپنے آپ کو جلا دوں گا تمہارے سامنے۔ اب میری راکھ کو سیندور سمجھ کر اپنی مانگ میں بھرنا!"

اب اُرملا سے نہ رہا گیا۔ میرا ہاتھ اس نے اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ میرے زخموں کی طرف دیکھا جو جل رہے تھے۔

اوران جلتے ہوئے زخموں پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے اور آہستہ آہستہ ان بیرحم آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے اور میری تشنہ روح کو سیراب کرتے گئے۔ اس وقت مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے مجھے سب کچھ مل گیا ہو۔ میں نے اُرملا کو اپنے سینے سے چمٹا لیا۔ اُرملا بھی میرے سینے سے لگی سسکیاں لیتی رہی۔ مُنہ سے تو کچھ نہ بولی۔ مگر اس کی سپردگی نے مجھے احساس دلادیا کہ وہ "میرے زخموں کی طرح میری ہے!"

آدم خور

سیٹھ رام نارائن، چمنستان فلم کمپنی کے حصّے خرید کر اس کا سب سے بڑا پارٹنر بن گیا۔ سیٹھ کو اچھی طرح معلوم ہو کہ وہ کیا کر رہا ہے؟ اسے روپوں سے کھیلنا آتا تھا۔ وہ سرمائے کے میدان میں نووارد نہ تھا۔ وہ اس سے پہلے ٹین کے ڈرموں کا کارخانہ کھول چکا تھا۔ وہ کارخانہ کھولتے ہی ایک اصول پر کاربند رہا۔ زیادہ سے زیادہ منافع حاصل کرو، اور مزدوروں کو کم سے اُجرت دو۔ بزنس میں جذبات کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ اگر انسان لوہے کی طرح سخت اور پتّھر کی طرح بے رحم ہو جائے تو کامیابی یقیناً ہوگی! اسی اصول کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے اس نے روپوں کا کھیل کھیلا۔ قسمت نے پورے طور پر اس کا ساتھ دیا۔ چند سالوں میں سیٹھ نارائن نے ڈرموں کے کارخانے کے علاوہ دو سیمنٹ فیکٹریاں اور کپڑوں کی ملیں خرید لیں۔ جب روپیہ مینہ کی طرح برسنے لگا، تو وہ فلم کمپنی کی طرف متوجہ ہوا۔ کیونکہ اس کاروبار میں سب کچھ تھا۔ روپیہ، عزّت، شہرت اور "عورت"! زندگی کے تمام لوازمات، جو انسان کو صرف جنّت میں مل سکتے، وہ سب یہاں میسّر ہیں۔

سیٹھ رام نارائن نے چمنستان فلم کا حصّہ دار بنتے ہی اپنا حلقہ بنانا شروع کیا۔ تھوڑے ہی عرصے میں اپنے جونیر پارٹنر گجادھر کے ہتھکنڈوں سے واقف ہوگیا۔ اگر سیٹھ نارائن چاہتا تو گجادھر کو ایک ہفتے کے اندر اندر باہر نکال دیتا۔ لیکن وہ گجادھر سے کچھ سیکھنا چاہتا تھا۔ آخر اس شخص کی اتنی دھاک کیوں تھی؟ اس کمپنی کے نوکر گجادھر سے کیوں ڈرتے تھے؟ ڈر کے علاوہ گجادھر نے پے در پے ایسی فلمیں بنائی تھیں کہ چمنستان فلم کمپنی کا ستارہ بام عروج پر جا پہنچا تھا۔

سیٹھ رام نارائن کو تھوڑے ہی عرصے میں معلوم ہوگیا کہ گجادھر اور سیٹھ رام نارائن میں کوئی خاص فرق نہ تھا۔ دونوں ایک ہی گُر کو آزماتے تھے کہ جس کے پاس روپیہ زیادہ ہو، وہ باقی انسانوں کی بے عزتی کرنے کا حق رکھتا ہے۔ فلمی دُنیا میں بے وفائی سے لے کر بے حیائی تک ہر شخص غیر اخلاقی قدروں کا پیکرِ اعظم بنا ہوا تھا۔

قدرت نے جس فراخ دلی سے سیٹھ رام نارائن کو روپیہ سے نوازا تھا۔ اسی فراخ دلی سے رنگ و روپ سے بھی محروم رکھا تھا۔ پستہ قد، کالی رنگت، نہایت بھونڈا چہرہ۔ مُنہ پر چیچک کے داغ۔ آنکھیں چھوٹی چھوٹی، صرف دانت سفید تھے۔ طرزِ تکلم میں بیباکی کے ساتھ ساتھ حد درجہ بد مذاقی تھی۔ کسی کی بے عزتی کرنا اپنا آبائی حق سمجھتا تھا۔ اس فلم کمپنی میں جو لوگ نوکر تھے، وہ اپنے پیٹ کی خاطر اس رویئے کو برداشت کر رہے تھے۔

سیٹھ رام نارائن کو کبھی اس بات کا خیال نہ آیا کہ فلم کا کاروبار دوسرے تجارتی شعبوں سے بہت مختلف ہے، جو چیز یہاں تیار ہوتی ہے اس کا تعلق جذبات اور احساسات اور کچھ حد تک ذوقِ حُسن سے ہوتا ہے۔ سیٹھ بھی کیا کرتا آج تک اس نے جتنے دھندے کیئے تھے ان کا اس طرح کی فضول باتوں سے کوئی تعلق نہ تھا۔

وہ کچھ عرصہ تک اپنے جونیر پارٹنر کی عیارانہ چالوں اور شاطرانہ حربوں کا مطالعہ

کرتا رہا۔ دراصل دونوں ہی کمینگی کے اظہار میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی کوشش میں تھے۔ اس لئے سیٹھ رام نارائن میں خود اعتمادی کا جذبہ بڑھا۔ گجادھر سب کو بے وقوف سمجھتا تھا اور اپنے آپ کو سب سے زیادہ ذہین۔ یوں تو فلم کمپنی میں جتنے لوگ کام کرتے تھے وہ سب بذاتِ خود ایک انجمن تھے۔ کمبخت یہ مکالمہ نویس اور افسانہ نگار نہ جانے اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہیں؟ فرماتے ہیں کہ —— سیٹھ کو کہانی کی سمجھ ہی نہیں، کردار نگاری کی الف۔ ب۔ ت سے بھی واقف نہیں زبان کے بارے میں بے چارہ کیا کہہ سکتا ہے۔ اُردو زبان سے نابلد ہے۔ عشق و محبت کی دُنیا اس نے بالکل نہیں دیکھی۔ احساسات اور لطیف جذبات کا خانہ ہی خالی ہے۔ اُونہہ بڑے آئے افسانہ نگار! میں ان کمبختوں کو افسانہ نگاری سکھاؤں گا۔ میں اُنھیں بتاؤں گا، کہ مکالمے کیسے لکھے جاتے ہیں۔ کلائمکس کسے کہتے ہیں۔ المیہ کسے کہتے ہیں، اور طربیہ کے کیا معنی ہوتے ہیں۔ اگر چند مہینوں کے اندر اندر یہ سب لوگ میری قابلیت کے قصیدے نہ پڑھنے لگے، تو میں اپنا نام بدل دوں گا۔

اور یہ شاعر، گیت کار، غالب اور اقبال کے شیدائی، دن رات عاشق و معشوق کی جُدائی کے سوا اور کوئی بات نہیں کرتے، میں رائے دیتا ہوں تو ہنس پڑتے ہیں۔ اور پھر گجادھر کی طرف دیکھتے ہیں۔ اس کی بات بہت غور سے سُنتے ہیں —— جی ہاں سیٹھ کو شاعری نہیں آتی۔ جمامو! سب کو شاعری سکھا دوں گا! اور اسی طرح ڈائریکٹر، ایکٹر، کیمرہ مین، سبھی کے سبھی مُجھ پر رعب جماتے ہیں۔ اور گجادھر کی گالیاں سُنتے ہیں۔ تنخواہ میں دوں، اور سب سے زیادہ گالیاں مجھے ہی پڑیں۔ میری فلم میں کام کریں، اور میری ہی رائے کی دھجیاں اُڑائیں۔ میں سیٹھ رام نارائن نہ ہوا، اُلّو کا پٹھا ہو کر رہ گیا۔ جب کبھی وہ اپنے آپ کو اُلّو کا پٹھا کہتا، تو اسے بیحد مزہ آتا۔

کافی تجربے کے بعد سیٹھ رام نارائن اس فیصلے پر پہنچا کہ اپنی کمپنی میں اپنے زیادہ

ذہین آدمی کو نوکر نہ رکھنا چاہیے۔ سب سے پہلے گجادھر کو نکالو، اس کمبخت نے سارے ماحول کو پراگندہ کر رکھا ہے۔ اسے نکالنا بہت ہی آسان تھا۔ اس کا روپیہ اس کے ہاتھ پر رکھو اور چلتا کرو۔ یوں بھی گجادھر اور رام نارائن میں اچھی خاصی تناتنی تھی۔ دونوں ایک ہی مزاج کے مالک تھے۔ رُوپوں کے پجاری، اور ہر شخص کی بے عزتی کرنے والے۔ گجادھر نے سوچا، روپیہ ملتے ہی دوسری کمپنی بنالیں گے، اس اُلّو سے کون نبھائے۔ سیٹھ رام نارائن نے گجادھر کا لگا ہوا سرمایہ واپس کر دیا، اور کمپنی کا تنہا مالک بن گیا۔

کمپنی کا تنہا مالک بنتے ہی اس ذہین مکالمہ نگاروں، افسانہ نگاروں، ڈائرکٹروں، اور کیمرہ مینوں کو کمپنی سے خارج کر دیا۔ جو باقی بچے وہ سیٹھ رام نارائن کے فل ٹائم چمچے بن گئے۔ سیٹھ جو بات کہے، وہ درست، باقی سب غلط! پُرانے نوکروں میں صرف سوری رہ گئے تھے۔ پندرہ برس سے وہ پروڈکشن منیجر تھے۔ جوانی کے دنوں میں ہیرو بنتے آئے تھے، اور جب ہیرو نہ بن سکے، تو پروڈکشن منیجر ہی بن گئے۔ یوں دیکھنے میں کافی خوش شکل تھے۔ بھاری جسم، لانبا قد، گورا رنگ، اور موٹے موٹے دانت، آواز کافی بھاری تھی۔ رات دن اسٹوڈیو میں رہتے۔ پروڈکشن کے علاوہ جو کام اور کوئی نہ کر سکتا، وہ انھیں سونپ دیا جاتا اور سوری صاحب اسے بخوشی کرتے کبھی کبھی وہ اداکاری بھی کر لیتے۔

سیٹھ رام نارائن کے آنے سے پہلے انھیں اس فلم کمپنی میں اہم حیثیت حاصل تھی۔ اور جب سیٹھ رام نارائن اس کمپنی کے مالک بنے تو سوری صاحب نے اپنے کام کی وجہ سے سیٹھ جی کے دل میں اپنی جگہ بنالی۔ پوری کمپنی میں سیٹھ جی صرف سوری کی عزت کرتے تھے۔ کیوں کہ سوری صاحب واحد شخص تھے جو تنخواہ کم لیتے، اور کام سب سے زیادہ کرتے۔ یوں سوری صاحب کمپنی میں کافی ہر دلعزیز تھے، وہ بڑوں کی عزت کرتے اور چھوٹوں کی حوصلہ افزائی ضرورت مندوں کو ایڈوانس دلواتے۔ کسی کو ترقی اور کسی کو نوکر رکھواتے۔ جب کوئی اور طریقہ مدد کرنے کا نہ ملتا تو اس کا میک اپ کرا دیتے۔ کمپنی میں کام کرنے والے تو سوری صاحب

پر جان چھڑکتے تھے۔

پچھلی فلمیں خوب چل رہی تھیں، اور روپیہ بے تحاشا آرہا تھا۔ سیٹھ جی کا دماغ عرش بریں پر تھا۔ اُنھیں دنوں سیٹھ جی پر عشق کا بھوت سوار ہوا۔ اپنی خوبیوں اور خامیوں سے سیٹھ جی اچھی طرح واقف تھے۔ پرمیلا چمنستان فلم کمپنی میں اس وقت وارد ہوئی جب سیٹھ جی اور کمپنی دونوں کا ستارا بلندی پر تھا، وہ اس روپہلی دُنیا میں اکیلی نہ آئی۔ اس کے ساتھ اس کی ذہین اور تجربہ کار ماں تھی جو اس میدان میں شہسوار کی حیثیت رکھتی تھی۔ مس پرمیلا اگر حسن و جمال کا نمونہ نہ تھی تو اسے بدصورت کہنا بھی پرلے درجہ کی بے وقوفی ہوگی۔

پرمیلا کی عمر بیس برس کے قریب ہوگی، لیکن اس نے سولھویں سال سے آگے کبھی قدم نہ رکھا۔ ناز، نخرے اور عشوہ طرازیوں میں اس کا جواب نہ تھا۔ اگر چہرہ کشش اور جاذبیت سے عاری تھا تو اس کی جگہ جسم کا بلاوا بے پناہ تھا۔ یوں بھی فلمی دُنیا میں سچائی کم ہوتی ہے۔ بدصورت چہرے کو خوبصورت بنانا کوئی مشکل کام نہیں یہاں بگڑی ہوئی صورتیں بن سنور جاتی ہیں، اور سنوری ہوئی صورتیں چند .... سالوں میں بگڑ جاتی ہیں۔ مختلف روشنیوں کے امتزاج سے میک اَپ، خاص قسم کا ماحول، پس منظر، اور رنگین ٹائٹ فٹ کپڑوں کے استعمال سے ایسا تاثر پیدا کیا جاتا ہے کہ انسان خدا کی خُدائی کو بھول جائے، اور انسان کی تخلیق پر ایمان لانے کے سوا کوئی چارہ نظر نہ آئے۔

سیٹھ جی سے ایک ہی ملاقات کرکے اَمّی جان نے فیصلہ کرلیا کہ معاملہ پٹ جائیگا۔ گو پرمیلا تو پہلی ملاقات کے بعد بہت رنجیدہ سی ہوگئی۔ اور روتی آواز میں اپنی ماں سے کہنے لگی :۔

"اَمّی جان یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ بھلا میں اس سیٹھ سے ___؟ میری صورت تو دیکھئے۔ مجھ میں کس بات کی کمی ہے اَمّی جان؟"

"روپوں کی بیٹی! اور پھر تم ہیروئن بننا چاہتی ہو، سیٹھ جی تمھیں ہیروئن بنا دیں گے، اور ساتھ ہی تمھیں اتنے روپے دیں گے کہ شاید تمھیں روپوں سے نفرت ہو جائے۔"

"اُمّی جان مجھے روپوں سے تو نفرت نہ ہوگی، بلکہ اس سیٹھ سے نفرت ضرور ہو جائے گی۔ بہت بدصورت سیٹھ ہے۔ صورت بھی نہیں دیکھی جاتی!"

"بیٹی، تم خوش قسمت ہو، کہ تمھیں ایسا سیٹھ ملا، جو تمھیں مالامال کر دے گا، مجھے تو ایسا سیٹھ ملا تھا کہ جو میرے زیورات بیچ کر خود سیٹھ بن گیا اور اس کے بعد اس نے مجھے سرِ بازار بیچ دیا۔ اگر اس وقت تم چوک گئیں تو زندگی کی بازی ہار جاؤ گی!"

"امّی جان! اسے بات کرنے کی تمیز بھی نہیں، مجھے تو اس سے گھن آتی ہے امّی جان!"

"پہلے شرطیں سُن لو، اگر ان سے تمھیں گھن آگئی تو انکار کر دینا:-

سب سے پہلے وہ ایک شاندار فلیٹ لے کر دے گا۔

تین سال کا ایک کنٹریکٹ، جو فلم فلمستان میں بنے گی، اس میں تم ہیروئن ہوگی۔

ہر مہینے تین ہزار روپے تنخواہ!

"کیا وہ مجھے تین سال کے لئے خریدنا چاہتا ہے امّی جان ــــ؟

"پرمیلا! لفظ خرید، اور فروخت کو اس تماشا گاہ میں بھول جاؤ، صرف اس بات پر غور کرو کہ کیا دیا ــــ؟ اور اس کے عوض میں کیا ملا ــــ؟ بیٹی! زندگی میں تھوڑا بہت غم برداشت کرنا پڑتا ہے۔ معاملہ بہت سیدھا اور صاف ہے۔ تمھیں سیٹھ سے کوئی محبت نہیں۔ اور سیٹھ کو تم سے کوئی محبت نہیں، اس کے پاس روپیہ ہے، اور ہمارے پاس روپیہ نہیں۔ وہ بدصورت ہے، اور تم خوبصورت ہو، وہ ادھیڑ عُمر کا آدمی ہے، تم جوان ہو۔ یہاں جذبات اور احساسات کا کوئی رشتہ نہیں۔ یہ معاہدہ میں نے بہت ٹھنڈے دل سے کیا ہے، تم بھی اس پر ٹھنڈے دل سے ہی غور کرو۔

قسمت نے جنت کا دروازہ کھول دیا، اسے بند کرنے کی کوشش نہ کرو!"

پرمیلا ماں کی باتیں سن کر خاموش ہو گئی، وہ روپے اور شہرت کی غرض سے اس شہر میں آئی تھی۔ اگر ایک فلم اسٹار بن گئی تو پھر اس سیٹھ کو کون پوچھے گا؟ دل کی دنیا سے سیٹھ کا کوئی تعلق نہیں۔ باقی رہا جسم کا معاملہ؟ اس کے بدلے اتنا کچھ مل رہا ہے کہ ساری عمر محنت کرکے اس کا عشر عشیر بھی نہ مل سکے گا۔"

فلمی دنیا میں اس طرح کے معاہدے اکثر ہوتے ہیں، ان واقعات پر نوحے لکھنا احمقانہ فعل ہوگا۔ حسن و عشق کی دنیا میں جتنا عشق اور حسن کو رسوا کیا جاتا ہے، اس کی مثال شاید ہی کہیں ملے۔ اگلے دن چمنستان کے ہر فرد کو معلوم ہو گیا کہ سیٹھ جی نے ایک لڑکی کو ہیروئن رکھ لیا ہے۔ سب لوگ آنِ واحد میں معاملے کی نزاکت سمجھ گئے۔ چند دنوں کے بعد، پرمیلا ہیروئن کی بجائے چمنستان کی سیٹھانی کہلانے لگی۔ یہ وقتی سیٹھانیاں گھر کی سیٹھانیوں کے مقابلے میں بڑی تیز طرار، اور چاق چوبند ہوتی ہیں، انھیں ناراض کرنا کمپنی سے باہر ہونے کے برابر ہے۔ گھر کی سیٹھانیاں تو صرف چابیوں کے گچھے لٹکائے پھرتی ہیں، لیکن یہاں کمپنی کے سارے نوکر آگے پیچھے لٹکے رہتے ہیں۔ سیٹھ رام نارائن کے دل میں پرمیلا کے لئے کوئی محبت نہ تھی۔ وہ آج بھی اسے اور اس کی ماں کو انھیں القاب سے نوازتا ہے جس کی وہ حقدار تھیں۔ پرمیلا نے شروع میں احتجاج نہ کیا۔ زہر کو امرت سمجھ کر پی گئی۔ جونہی دو چار فلمیں چل نکلیں کہ اس نے پر نکالنے شروع کئے۔ اب وہ سیٹھ رام نارائن کے رحم و کرم پر زندہ نہ تھی، اس کی مانگ باہر بھی تھی۔ بھلا اب اسے کیا پروا تھی؟ عزت، دولت اور شہرت پاؤں چوم رہی تھی۔

تھوڑی سی کامیابی کے بعد پرمیلا اور اس کی ماں نے سیٹھ کے ساتھ ایسا سلوک کیا کہ بے چارہ بھنّا سا گیا۔ یہ حرافہ اب آبرو لینے پر اُتر آئی تھی۔ جب گھر جاؤ تو ڈرائنگ روم میں ایک ایک گھنٹہ انتظار کرنا پڑتا ہے۔ نوکرانی آکر کہتی ہے:-

"ابھی پرمیلا بائی سنگھار کر رہی ہیں۔ نئی ساڑھی پہن کر ابھی آتی ہیں۔" سیٹھ جی اتنے عرصہ امّی جان سے دل بہلاتے رہیے۔ اور جب کبھی دونوں اکٹھے ہوتے تو پرمیلا اپنی نفرت چھپانے کی کوشش نہ کرتی۔ ہر بار وہ سیٹھ کو جتانے کی کوشش کرتی کہ وہ اس کے حُسن کی دہلیز پر بھکاریوں کی طرح کھڑا ہے۔ اس معاملہ بندی میں نہ چاہت تھی، نہ عشق، نہ گرمی۔ نہ رکھ رکھاؤ، نہ اخلاق، نہ انسانیت کی کوئی رمق۔ بس جسم اور روپوں کا لین دین۔ سیٹھ رام نارائن کو پہلی بار محسوس ہوا کہ روپئے کی فراوانی نفرت کو محبت میں نہیں بدل سکتی، یہ سودا تو گھاٹے کا ہے۔

دل میں نفرت کے طوفان اُٹھتے، لیکن سیٹھ رام نارائن کیا کرتا؟ وہ حکومت کرنے کا عادی ہو گیا تھا، پرمیلا کو اپنی جائداد سمجھ کر اس سے وہی سلوک کرتا جو اپنے ملازموں سے کرتا تھا۔ پرمیلا اس کی ملازمہ ضرور تھی لیکن اب صرف اس کے رحم و کرم پر زندہ نہ تھی۔ بیچارے سیٹھ کو کیا معلوم تھا کہ فلمی چکر روپوں سے نہیں چلتا، ایک دردمند دل کا ہونا بھی ضروری ہے۔

سیٹھ رام نارائن اپنی ڈگر پر قائم رہے۔ اب ان کی فلمیں ایک کے بعد ایک فیل ہو رہی تھیں۔ کمپنی کی ساکھ روز بروز کم ہو رہی تھی، اب تو لاگت تک واپس نہیں آتی۔ ان کمبخت اسٹوری رائٹروں کو کچھ نہیں آتا۔ جو شخص اپنے بال بچوں کو پال نہیں سکتا وہ کہانی کیا لکھے گا؟ یہ ڈائرکٹر، کیمرہ مین۔ میک اپ مین۔ ایڈیٹر۔ چھوٹے بڑے ایکٹر سبھی جاہل ہیں۔ میں انھیں ہر ماہ باقاعدہ تنخواہ دیتا ہوں، اور میری فلمیں باقاعدگی سے فیل ہو رہی ہیں۔ اب میں کسی طرح کی کوئی دخل اندازی برداشت نہیں کروں گا۔ اب تو یہ حال ہو گیا کہ کہانی لکھنے سے لے کر فلم بننے تک ہر شعبے میں سیٹھ رام نارائن کا ہاتھ تھا۔ پہلے تو فلمیں ایک دو ہفتے چلتی تھیں۔ پوری ذمے داری سنبھالنے کے بعد فلمیں تین چار دن چل کر سیٹھ کے گودام میں پہنچ جاتیں۔ اب تو کمپنی میں گھاٹا ہی گھاٹا تھا۔ سیٹھ روز بروز چڑچڑا ہو رہا تھا، اور طرزِ تکلم کے

سلسلے میں بد ذوقی آخری حدوں کو چھو رہی تھی۔ اسے بات کا کبھی خیال نہ آیا کہ فلم بنانا سیمنٹ کا بیوپار نہیں، یہ ٹیکسٹائل مل نہ تھی۔ ٹین کے ڈبّوں کے بنانے کا کارخانہ نہ تھا۔ یہ کاروبار ضرور ہے، لیکن اس کا دل کی بستی سے تھوڑا بہت تعلق ضرور ہے۔ کسی کو ہنسانا آسان نہیں، اور کسی کو رُلانا بھی بہت مشکل کام ہے، خاص کر فلم میں زندگی میں نہیں۔

اسی دوران میں جب سیٹھ نارائن کی فلمیں فیل ہو رہی تھیں، پرمیلا سیٹھ جی سے الگ ہو گئی۔ کیوں کہ اسے ایک دوسری کمپنی سے ایک بڑے معاہدے کی پیشکش تھی۔ سیٹھ نے سمجھانے کی کوشش کی۔ عدالت میں لے جانے کی دھمکی بھی دی لیکن پرمیلا نہ مانی۔ سیٹھ ایک موٹی سی گالی دے کر خاموش ہو گیا، خیر وہ کسی اور فاختہ کو اپنا لے گا پیسے کی کمی نہیں۔

اس عرصے میں کئی بار سوری صاحب نے مودبانہ انداز میں سیٹھ جی کو سمجھانے کی کوشش کی کہ جس راستے پر وہ چل رہے ہیں، وہ راستہ تباہی اور بربادی کی طرف جاتا ہے۔ فلم ایک دھندا ضرور ہے سیٹھ جی، لیکن ایک آرٹ ہے۔

"یہ آرٹ کیا ہوتا ہے؟" سیٹھ چیخا۔

بھلا سوری اسے کیا سمجھاتا کہ درد کیا ہے؟ آہ و فغاں کسے کہتے ہیں؟ آدمی روتا کیوں ہے؟ ہنستا کیوں ہے؟ عورت خوبصورت کیوں ہوتی ہے؟ فراق و وصل، شعر، مصوری۔ اچھائی، برائی اور دردمندی یہ سب کیا ہے ــــ؟ سوری کیا کہتا؟ وہ خود بوڑھا ہو چلا تھا۔ سر کے بال سفید ہو گئے تھے، اور پیٹ پہلے سے زیادہ بڑھ گیا تھا۔

ایک گھٹیا فلم کا سیٹ لگا ہوا تھا۔ رات کا وقت اور برسات کا موسم تھا، رات کے دس بج چکے تھے۔ فلم "کھٹ پٹ" کا ہیرو اشور ابھی تک نہیں آیا۔ فون پر سیٹھ جی نے سوری کو طلب کیا، اور اس سے صاف صاف کہہ دیا کہ ہیرو اشور اگر رات کے بارہ بجے تک نہ آیا تو تمھیں نوکری سے برخاست کر دیا جائے گا! سیٹھ کی آواز میں رعب اور تحکم تھا، وہ جانتا تھا کہ ہیرو رات کو سیٹ پر نہ آیا تو اسے یقیناً نوکری سے برخاست کر دیا جائے گا۔

ایک بیوی، چھ بچے .... ؛ نوکری چلی گئی تو وہ کس کے سہارے زندہ رہیں گے ؟
بس یہ سوچتے ہی وہ اپنی پرانی کار لے کر ہیرو کے گھر کی طرف بھاگا۔ راستے میں کار کا ٹائر پنچر ہوگیا۔ کار وہیں چھوڑی اور موسلا دھار بارش میں بھیگتے ہوئے وہ ہیرو کے گھر پہنچے۔ وہاں نوکر نے بتایا کہ صاحب اپنی گرل فرینڈ کے گھر گئے ہوئے ہیں۔ ٹیکسی لے کر وہ ہیرو کی محبوبہ کے گھر پہنچے تو محبوبہ کی ممّی نے بتایا کہ میری جُو ہُو گئی ہوئی ہے۔ وہ سیدھا جوہو پہنچا اور کئی ہوٹلوں کے چکّر مار کے، اس نے ایشور اور میری کو ڈھونڈ لیا۔ دونوں شراب میں بدمست تھے۔
سوری نے شوٹنگ کی یاد دلائی اور سیٹھ جی کی ڈانٹ کا ایک حصّہ سنا دیا۔

ہیرو آگ بگولا ہوگیا۔ پہلے سیٹھ کو خوب گالیاں دیں، پھر سوری شراب پیش کی۔ اس نے پینے سے انکار کر دیا۔ تو ہیرو نے سوری کو پیٹنا شروع کیا۔ لات اور گھونسے مار کر باہر نکال دیا۔

سوری بارش میں بھیگتا ہوا، بس سے اُترتا چڑھتا ہوا، اپنے گھر پہنچا۔ بیوی جاگ رہی تھی۔ بیوی نے پیشانی کو چھوا تو پیشانی تپ رہی تھی۔ بستر پر لیٹتے ہی سینے میں شدید درد شروع ہوگیا۔ ڈاکٹر کو بلایا تو معلوم ہوا کہ ڈبل نمونیہ ہوگیا ہے۔ کافی علاج کیا گیا، لیکن پانچ دن نہ گزرنے پائے تھے کہ سوری راہیِ مُلکِ عدم ہو گئے۔

جب سوری کی موت کی خبر اسٹوڈیو میں پہنچی ایک کھلبلی سی مچ گئی۔ سوری کے بل بوتے پر یہ فلم کمپنی چل رہی تھی۔ اس کا سایہ اُٹھنے کے بعد ہر شخص اپنے آپ کو یتیم سا محسوس کرنے لگا۔ سبھی نے مل کے فیصلہ کیا کہ آج کے دن اسٹوڈیو بند ہونا چاہیے۔ کمپنی کیسے بند ہو—؟ مالک تو سیٹھ رام نارائن تھے۔ اگر سیٹھ جی مان جائیں تو سب کی عزّت رہ جائے۔ اس لئے سب لوگ سیٹھ رام نارائن کے کمرے میں داخل ہوئے۔

سیٹھ جی اپنی کرسی پر براجمان تھے— "کیا بات ہے؟" اتنے بڑے جمگھٹے کو دیکھ کر سیٹھ جی بھڑک اُٹھے۔

"جی، سوری صاحب کے موت کے بارے میں آپ کو علم ہوگا؟"

"ہاں مجھے معلوم ہے، سوری مرگیا۔ تو پھر کیا ہوا؟"

"جی، ہم چاہتے ہیں کہ........"

"کیا چاہتے ہو؟"

"کہ آج کے دن اسٹوڈیو بند کیا جائے، تاکہ ہم سب لوگ سوری صاحب کے جنازے میں شریک ہوسکیں!"

"تم سب بیوقوف ہو!" سیٹھ جی کڑکتی ہوئی آواز میں بولے۔

"جی؟"

ارے احمقو! اگر حلوائی کی دکان میں چوہا مرجائے تو جانتے ہو حلوائی کیا کرتا ہے؟"

"جی نہیں" سب نے یک زبان ہوکر کہا۔

"ارے کمبختو! وہ چوہے کو اٹھاکر باہر پھینک دیتا ہے، اپنی دوکان بند نہیں کرتا۔"

سب سیٹھ کی طرف حیرت سے دیکھنے لگے۔ جو نفرت ان کے دلوں میں تھی، سمٹ کر ایک لفظ پر آگئی، کمرے سے نکلتے ہوئے ہر شخص کی زبان پر ایک ہی فقرہ تھا۔

"یہ سیٹھ انسان نہیں ہے، آدم خور ہے!!"

داستان میری ذکر تیرا

آج کل جب لکھنے بیٹھتا ہوں تو تمھارا چہرہ نگاہوں کے سامنے گھوم جاتا ہے چاہتا ہوں کہ تمھارے ساتھ جو لمحات گزرے تھے، انھیں لفظوں میں پرو کر اپنے احساسات کو افسانے کا رُوپ دے دوں۔ لیکن نہ جانے کیوں میرے دل میں خیال آتا ہے کہ اس افسانے کا نہ کوئی آغاز ہے، نہ انجام! بس یہ چند لمحات کی کہانی ہے جس کا روشن رُخ بہت تابناک اور درخشاں ہے۔

جب تمھاری تصویر بنانے لگتا ہوں تو جذبات وخیالات اور واقعات ایک دوسرے سے اس طرح اُلجھ جاتے ہیں کہ کوئی معین راستہ اختیار نہیں کرتے۔ الفاظ بے معنی ہو کر رہ جاتے ہیں۔ کوئی مصور ہی تمھاری تصویر بنا سکتا ہے، جو تمھارے حسن وجمال، رنگ و روپ اور تمھارے چہرے کے حسین خطوط کو یوں اُجاگر کرے کہ صدیوں کے لئے تمھارا حُسن امر ہو جائے۔ یا کوئی مجسمہ ساز سنگِ مَرمَر کی کسی سل سے ایسے نقش ابھارے جو اَبد تک زندہ رہیں۔ لفظوں کے پیکر میں تمھاری اور میری محبت کا افسانہ بڑا پھیکا اور بیکار رہے گا۔

پھر بھی کوشش کروں گا کہ لفظوں کی مدد سے تمہاری ایک تصویر کھینچوں، جو میں نے دیکھی، اور محسوس کی ہے۔ ایک معاملے میں خدا مجھ پر بڑا مہربان رہا ہے اور اس کے لئے میں پروردگار کا بڑا احسان مند ہوں کہ خدائے برتر نے ایسے لمحات ضرور عطا کئے، جب جنون کی حد سے دوچار ہوا۔ اگر میں ان لمحات سے دست و گریباں نہ ہوتا تو مجھے اس بات کی خلش ہی رہتی کہ میں نے اس دُنیا میں آکر کچھ نہیں کیا۔ ایک بیکار، بے معنی اور بے رنگ زندگی گزار دی۔

تم سے اس وقت ملاقات ہوئی، جب میں ادھیڑ عُمر میں قدم رکھ چکا تھا۔ کنپٹیوں کے گرد بال سفید ہونے لگے تھے۔ گو چہرے مُہرے سے اتنا بوڑھا نظر نہ آتا تھا، مگر جب کبھی اپنے اندر جھانک کر دیکھتا، تو ایک ہی خیال رہ رہ کر دل میں اُبھرتا کہ اب زندگی کے دن بہت تھوڑے رہ گئے ہیں۔ شاید یہ تمہیں معلوم نہیں کہ میں بیس برس سے موت کا انتظار کر رہا ہوں، لیکن موت ابھی تک نہیں آئی۔ ابھی نہ جانے اور کتنے برس زندہ رہنا پڑے گا۔

تمہارے آنے سے پہلے میں محسوس کرتا تھا کہ شاید میرے دل کی دھڑکن بند ہو گئی ہے۔ دل دھڑکتا ضرور ہے، لیکن یہ دھڑکن کیسی، جو انسان کو صرف چلنے، پھرنے، کھانے، پینے کے قابل بنائے رکھے، اس طرح کی دھڑکن قابلِ احترام نہیں ہوتی۔ زندگی کا یہ طویل سفر بہت تکلیف دہ رہا۔ جب میں جوان تھا، تو انکار سُنتے ہی پھڑک اُٹھتا تھا۔ کسی کی تنقید برداشت نہ کر سکتا تھا۔ میرے خلاف کوئی ایک جملہ بھی کہتا تو میری آنکھوں میں خون اُتر آتا۔ آج یہ حالت ہے کہ لوگ میرے مُنہ پر مجھے گالیاں دیتے ہیں، اور میں خاموش رہتا ہوں، اپنے عزیز و اقارب، یار دوست، جان پہچان والے میری بے عزتی کرتے ہیں۔ پھر بھی میرے منہ سے کوئی ناگوار جملہ نہیں نکلتا۔ لوگ میرا حق مجھ سے چھین لیتے ہیں، اپنے غیروں جیسا سلوک کرتے ہیں۔ پھر بھی میں صرف اپنے آپ سے کہتا ہوں، ٹھیک ہی کرتے ہیں یہ لوگ۔

شاید میں اسی سلوک کا مستحق ہوں۔ اب نہ کسی کے خلاف کوئی شکوہ ہے، نہ شکایت، نہ محبت، نہ نفرت، ایک ایسی کیفیت سے دوچار ہوں جو اکثر صوفیوں پر طاری ہو جاتی ہے۔۔

میں کچھ ایسے ہی جذبوں، خیالوں، اور احساسات کے ساتھ زندگی کے دن کاٹ رہا تھا کہ اچانک تم میری زندگی میں داخل ہوئیں۔

اس سے پہلے تمہیں دو بار دیکھا تھا۔ ایک بار اس وقت دیکھا، جب تم شاید تیرہ برس کی تھیں۔ اس وقت تمہارا قد تمہاری سہیلیوں سے کافی لمبا تھا تم بہت دبلی پتلی تھیں، ہاں چہرے کے خطوط بہت تیکھے تھے۔ گورا گورا لمبوترہ چہرہ۔ بڑی بڑی روشن آنکھیں، پتلی سی ناک، زرد، زرد گال، لمبی لمبی باہیں، جسم پر گوشت کم، ہڈیاں زیادہ۔ تمہاری اور میری عمر میں کافی فرق تھا، میں نے ایک اچٹتی ہوئی نگاہ تم پر ڈالی۔ ایک دو باتیں پوچھیں تمہارے جوابوں میں سنجیدگی تھی، بچپنا نہ تھا۔ اس وقت میں نے محسوس کیا کہ اس عمر میں لڑکیاں اتنی ذہین نہیں ہوتیں، ذہانت کے علاوہ اور کسی چیز نے مجھے متاثر نہ کیا۔

دو سال کے بعد پھر تمہیں دیکھا۔ اس وقت تمہاری عمر پندرہ برس کی تھی۔۔ قد اور لمبا ہو گیا تھا۔ تمہیں دیکھ کر مجھے یوکلپٹس کے پیڑ کا خیال آیا جہاں تک تمہارے جسمانی خدوخال کا تعلق تھا، اس میں کوئی نمایاں فرق نہ تھا۔ وہی لانبا قد، پتلی، اور دبلی باہیں، وہی زرد، زرد سے رخسار، پتلے پتلے سے ہونٹ۔ جذبات اور احساسات سے خوفزدہ۔ ہاتھ کی انگلیاں لانبی اور پتلی پتلی سی، پتلی کمر، ساڑھی بھی سلیقے سے نہ باندھ پائی تھیں، جب تک جسم پر کافی گوشت نہ ہو، کم بخت ساڑی بھی بیکار سا لباس معلوم ہوتی ہے تم نے ساڑی کو جسم ڈھانپنے کے لئے استعمال کیا تھا، بس چہرہ نظر آتا تھا، گوری گوری صراحی دار گردن اور اس کے علاوہ گردن سے لے کر پاؤں تک ساڑی ہی ساڑی نظر آتی تھی، اور کچھ نہیں! عجیب وحشت اور اداسی تمہارے چہرے سے ٹپکتی تھی۔ میں نے تمہاری طرف ایک دو بار دیکھا اور تم میں کوئی خاص دلچسپی نہ لی۔ شاید میرے اس رویے نے تمہاری امنگوں

اور آرزوؤں کو اپنے ہی تک محدود رکھا۔ ہوسکتا ہے تم کچھ کہنا چاہتی ہو، لیکن اس وقت کہہ نہ سکیں، ایک دو بار تم کہنے کے لئے بے قرار ہوگئیں۔ یہ کیسی بیقراری تھی، یہ کیسی تڑپ تھی، جس کی چنگاریاں مجھ تک نہ پہنچ سکیں۔ تم پہلے میرے سامنے کرسی پر بیٹھی تھیں، پھر اُٹھ کر بالکنی پر چلی گئیں۔ وہاں بہت دیر تک کھڑی رہیں۔ میں کتاب پڑھتا رہا —— اور تمھارے قد و قامت سے متاثر ہوئے بغیر اپنے خیالوں میں اُلجھا رہا۔ میں نے سوچا ایک پندرہ سال کی لڑکی سے مجھے کیا نسبت —— پھر نہ جانے کیوں تم میرے قریب آئیں اور بہت رازدارانہ انداز میں تم نے کہا:

"میں کل جا رہی ہوں۔"

"کہاں؟"

"کام پر!"

"کام مل گیا؟ بہت خوب!"

میں نے یہ پوچھنے کی بھی کوشش نہ کی کہ آخر کہاں جا رہی ہو؟ کون سا کام ملا ہے، کب تک واپس آؤ گی؟ مجھے ان باتوں سے غرض نہ تھی۔ یہ میں جانتا تھا کہ تمھارے والدین کی مالی حالت اچھی نہیں۔ گھر میں تم ہی سب سے بڑی ہو، اگر تم نے کمانے کے لئے ہاتھ پاؤں نہ مارے تو سب لوگ فاقوں سے مر جائیں گے، میں نے بہت روکھے انداز میں کام ملنے پر تمھیں مبارک باد دی۔ تم نے اچانک میرے پاؤں چھوئے۔ تمھارے ہاتھ لگتے ہی میرے سارے جسم میں ایک کپکپی سی دوڑ گئی۔ میں نے سوچا اس لڑکی کے دل میں میرا کتنا احترام ہے۔ میں نے کیا کیا ہے، اس لڑکی کے لئے۔ اس لڑکی نے میرے پاؤں کیوں چھوئے۔ میں حیرت بھری نگاہوں سے تمھاری طرف دیکھتا رہا، اور پھر تم ڈولتی، اور جھولتی ہوئی ساری کے پلّو کو سنبھالتی ہوئی، مجھ سے کچھ کہے بغیر میری نظروں سے اوجھل ہوگئیں۔

تین سال گزر گئے۔ وقت بڑی تیزی سے بیت رہا تھا۔ چاروں طرف عجیب انتشار

تھا۔ پچھلی قدریں مٹ رہی تھیں۔ نئی قدروں پر لوگوں کو بھروسہ نہ تھا۔ میری تو ان تین برسوں میں کایا پلٹ ہوگئی۔ کسی آدرش پر ایمان نہ رہا۔

سیاست کی بساط پر کئی چہرے ابھرے اور آپس میں لڑ جھگڑ کر راہی ملک عدم ہوگئے۔

میں اس اجنبی شہر میں اپنی قسمت بنانے کے لئے آیا تھا، مگر کئی سال گزرنے کے بعد مجھے یہ محسوس ہوا کہ جہاں سے چلا تھا وہیں کھڑا ہوں، اپنے بھی پرائے ہوگئے، دوست، رشتے دار، بہن، بھائی سب سے رشتے ناطے ٹوٹ گئے۔ اس دنیا میں بالکل اکیلا رہ گیا۔ اب کسی کے لئے کچھ کرنے کو جی نہیں چاہتا ـــــ جو شخص اپنے لئے کچھ نہ کر سکا، وہ دوسروں کے لئے کیا کرے گا۔ کسی کام میں دلچسپی نہ رہی۔ انسانیت، اخوت، شرافت، دیانت داری، نیکی جیسے لفظوں سے بالکل نفرت ہوگئی۔ میں نے اپنے گرد دیکھا تو معلوم ہوا جو لوگ کل تک سوشلزم کے مبلغ تھے آج سرمایہ داری کے اہم ستون بن گئے۔ جو بت شکن تھے، بت پرست بن گئے۔ دیش سیوا کی جگہ اپنی سیوا نے لے لی۔ دوسروں کی حالت سُدھارنے کے بجائے لوگ اپنی حالت سُدھارنے لگے۔ عجیب افراتفری کا زمانہ تھا۔ اب کوئی کسی کا نہیں۔ چاروں طرف نفسی نفسی تھی۔ شرم، شرافت، عزت، انکساری کا لین دین نہیں کرتا۔ اس دور میں کوئی رہ کر کیا کرے۔ جیئے تو کس طرح! اور پھر کس کے لئے؟۔

اس قسم کی بے بسی اور بے حسی میں نے اس سے پہلے کبھی محسوس نہ کی تھی۔ میں سارا سارا دن گھر میں بیٹھا رہتا۔ کسی سے ملنے کو جی نہ چاہتا۔ یہاں تک کہ کسی خوبصورت لڑکی کو دیکھ کر بھی جی خوش نہیں ہوتا۔ نیلے آسمان کو دیکھتے ہوئے ایک زمانہ گزر گیا۔ میرے گھر کے قریب ہی سمندر تھا۔ سمندر دیکھتے ہوئے کتنا عرصہ ہوگیا۔ نہ لہریں اچھی لگتیں، نہ پھیلا ہوا سمندر ـــــ لوگوں کی طرف دیکھنے کو جی نہ چاہتا۔ یہ کیسے لوگ تھے۔ یہاں کیوں آئے ہیں، کب واپس جائیں گے، آپس میں باتیں کیوں کرتے ہیں۔ کون انھیں آنے کے لئے کہتا ہے؟ اور اتنا عرصہ سمندر کے کنارے بیٹھ کر کیا کرتے ہیں۔ لڑکیاں خوبصورت

کپڑے کیوں پہنتی ہیں؟ اپنے بال کیوں سنوارتی ہیں، لپ اسٹک کیوں لگاتی ہیں؟ ان کے کولھے اتنے بڑے کیوں ہیں؟ سینہ اتنا اُبھرا ہوا کیوں ہے؟ یہ کھلکھلا کر کیوں ہنستی ہیں؟ اور مڑ مڑ کر کیوں دیکھتی ہیں؟ یہ جوڑا ہاتھوں میں ہاتھ دیئے کیوں چلا جا رہا ہے؟ یہ لوگ اتنے بے شرم کیوں ہو گئے ہیں؟ چاروں طرف ہنگامہ برپا ہے۔ پھر بھی مجھے کچھ سُنائی نہیں دیتا۔ سڑکوں پر بسیں چل رہی ہیں۔ ریل گاڑیاں اتنی رفتار سے رواں دواں ہیں۔ لوگ آ رہے ہیں، جا رہے ہیں۔ بچے روتے ہیں۔ بڑے ہوتے ہیں۔ اسکول جاتے ہیں، پھر مر جاتے ہیں۔ لوگ شادیاں کرتے ہیں۔ دُلہنیں بیوہ ہو جاتی ہیں۔ مائیں مر جاتی ہیں، بھائی ایک دوسرے سے بچھڑ جاتے ہیں، لوگ ایک دوسرے کو قتل کر دیتے ہیں ـــــ لیکن میرے ذہن پر کسی بات کا اثر کیوں نہیں ہوتا؟

ہائے، کیا ہو گیا ہے میرے احساسات کو کیا ہوا؟

چاروں طرف اتنا شور ہے، مجھے کچھ سُنائی نہیں دیتا۔ دُنیا اتنی بڑی ہے اور مجھے اتنی چھوٹی کیوں دکھائی دے رہی ہے۔ آدمی نے چاند پر کمندیں ڈالی ہیں، اور مجھے انسان اتنا حقیر اور ذلیل کیوں نظر آتا ہے۔ مجھے قدرتی مناظر کیوں اچھے نہیں لگتے؟ شاید میرا آخری وقت آ گیا ہے، جب انسان کی ہر خواہش، ہر اُمید، ہر تمنا مر جاتی ہے۔ جب جذبات و احساسات اور آدرش معطل ہو جاتے ہیں۔

میرے چاروں طرف ایک عجیب سی بے اطمینانی، بے یقینی، بے غیرتی اور بے حسی کا دور دورہ تھا، چاروں طرف موت کا سناٹا تھا۔ بس اسی وقت تقریباً تم نے تین سال بعد میرے گھر میں قدم رکھا۔ اب تمھاری عُمر اٹھارہ برس کی ہو چکی تھی۔ اَب جب تُم آئیں تو تم میں اور تم سے پہلے جو لڑکی مجھ سے ملی تھی ان دونوں میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔

مجھے وہ شام اچھی طرح یاد ہے۔ ذہن میں ابھی تک تر و تازہ ہے۔ میں کتاب

پڑھ رہا تھا اور تم بالکنی میں کھڑی تھیں، میں نے کتاب سے نظر بچا کر تمہاری طرف دیکھا۔ ہاں وہی سرو قد ـــــ وہی گوری گوری صراحی دار گردن نگاہ نیچے گئی۔ اب تمہارا جسم بھر گیا تھا۔ چہرہ لمبوترہ ضرور تھا، لیکن اس پر گوشت کی ایک تہہ آگئی تھی۔ رخساروں پر زردی نہ تھی، ہلکی ہلکی سُرخی نمایاں تھی۔ کانوں میں سبز رنگ کے آویزے، لرز رہے تھے اور پھر تم نے ایک سفید برّاق ساڑی جس کا پلّو بے حد رنگین اور پُرکشش تھا، بہت فنکارانہ انداز سے پہن رکھی تھی۔ تمہارے جسم کے خطوط اس ساڑھی میں جاگ اُٹھے تھے۔ میں تمہیں دیکھتا رہا۔ تمہارے لانبے قد اور جسم کے حسین خطوط سے لطف اندوز ہو رہا تھا کہ اچانک تمہاری ساڑھی کا پلّو تمہارے سینے سے ڈھلک گیا۔ شاید ہوا کے تیز جھونکے سے ایسا ہوا یا شاید تم نے خود اپنی ساڑی کے پلو کو اپنے سینے سے گرا دیا۔ میری نگاہیں اچانک تمہارے شفاف سینے سے ٹکرائیں، اور ایک ہلکا مدھم مدھم سانٹ میری رگ وپے میں سما گیا۔ پھر تم مُڑ گئیں۔ اب تمہاری پُشت میری طرف تھی۔ واقعی تمہیں ساڑھی باندھنے کا سلیقہ آگیا تھا۔ تمہارا رنگ تو پہلے ہی گورا گورا سا تھا۔ لیکن گوری رنگت میں بہار اور اُبھار کہاں سے آگیا! کلی پھول کیسے بن گئی؟ آج ہوا اتنی لطیف کیوں ہے؟ اور بھینی بھینی خوشبو کہاں سے آرہی ہے؟ تمہاری پیشانی پر زُلف کیوں لہرا رہی ہے؟ کمر سے نیچے کا حصّہ اتنا کھُلا ہوا کیوں ہے؟ ـــــ شاید آج کل کا یہی فیشن ہے۔ تم نے اپنے آپ کو دل نشین، دل فریب اور دل کش بنانے میں کوئی کسر باقی نہ رکھی۔ یہ دل لبھانے کے انداز کس نے سکھائے؟ ـــــ میں سوچ رہا تھا، کیا تم وہی لڑکی ہو جسے میں نے چند سال پہلے بالکل نظر انداز کر دیا تھا۔ میں تمہاری طرف دیکھتا رہا اور مبہوت سا ہو گیا، تمہارے شباب کی شادابی کو دیکھ کر میں واقعی محظوظ ہوا۔

میرے چہرے کے رنگ کو دیکھ کر تم نے میری قلبی کیفیت کو بھانپ لیا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ تم اپنے جذبات پر قابو نہ پاسکیں اور تم بالکنی سے تیزی سے چل کر میری

طرف لپکیں، اور مجھ سے کہنے لگیں :

"مجھے کشمیر لے چلو!"

یہ فقرہ سُن کر میں ہکا بکا رہ گیا۔ تم کون ہو؟ مجھ سے اس طرح کیوں ہمکلام ہوئیں؟ تم مجھے نہیں جانتیں، میں تمھیں نہیں جانتا۔ تم میرے قریب کیوں آنا چاہتی ہو؟ —— میں نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ میں نے تمھیں سمجھنے کی کوشش کی۔ اس فقرے کا مطلب کیا تھا؟ میں تو کشمیر دیکھ چکا تھا اور جب سے بمبئی آیا کشمیر نہ گیا۔ لیکن اُس خطّے کے چپّے چپّے سے واقف تھا۔ میرے ذہن میں کشمیر کی وادی گھوم گئی۔ وہاں کے مرغزار، وہاں کے بلند و بالا پہاڑ، گہری نیلی جھیلیں، نرم ریشمی گھاس، بے حد فرحت بخش ہوا۔ چھوٹے چھوٹے چشموں، آبشاروں اور دریاؤں کا ٹھنڈا ٹھنڈا پانی۔ برف سے ڈھکی ہوئی پہاڑوں کی چوٹیاں۔ دیودار اور چیڑ کے درخت، خوبصورت پرندے پھولوں سے ڈھکی گلمرگ اور پہلگام کی جنّت نگار وادیاں۔ سڑک کے دونوں طرف یوکلپٹس کے پیڑ، آسمان کو چھوتے ہوئے گھنے گھنے جنگل۔ بلند قامت پہاڑوں کی اوٹ سے سورج کا طلوع ہونا، اور پھر سُورج کی کرنوں کا ساری وادی پر پھیل جانا، اور پھر جب بہار آتی ہے، پہاڑوں پھلنے لگتی ہے۔ خوبانیوں، ناشپاتیوں کے درختوں پر پھول کھلنے لگتے ہیں اور انگوروں کی بیلوں پر یاقوت کی طرح چمکنے لگتے ہیں۔ ہوا میں بڑی تازگی اور شگفتگی آجاتی ہے۔ یہ سارے معجزے قدرت کے تھے، اور تم انھیں چاہتی ہو، انھیں کون دیکھنا نہیں چاہتا؟۔

ہاں جب میں وہاں تھا تو اس وقت تم میرے ساتھ نہ تھیں۔ آج تم مجھے دعوت دے رہی ہو کہ میں تمھیں اپنے ساتھ لے چلوں۔ میری آنکھوں کے آگے گلمرگ کی سرسبز و شاداب وادِ رقص کرنے لگیں۔ بادِ صبا اٹکھیلیاں کرنے لگی۔ نرم نرم گھاس پر چلتے چلتے میری آنکھوں میں غنودگی سی طاری ہونے لگی۔ پگلی تم نے فقرہ کس سے کہا اور کس وقت کہا۔ شاید تمھیں یہ معلوم نہیں کہ میں اس وقت مکمّل انسان بن چکا ہوں۔ جانتی ہو اس وقت انسان مکمّل انسان بن

جاتا ہے جب اس میں بچپن کا احساس مرجاتا ہے۔ جب وہ شباب کی سلگتی ہوئی آگ سے محروم ہو جاتا ہے۔ یعنی جب اس کے پاس کچھ نہیں رہتا۔ جب اس کے جذبات اور احساسات مرجاتے ہیں۔ جب اس کے ذہن سے خوبصورتی کا احساس مٹ جاتا ہے —— جب وہ کچھ کرنے کے قابل نہیں رہتا، اس وقت وہ مکمل انسان بن جاتا ہے۔

تم نے یہ کیا کیا؟ کچھ تو سوچا ہوتا کہ یہ شخص جو تمھارے سامنے بیٹھا ہے، جس کے ہاتھ میں ایک کتاب ہے، جس نے کتنے افسانوں اور کتابوں کی تخلیق کی ہے —— آج ایک کورے ورق کی طرح سامنے ہے۔ وقت بے رحم ہاتھوں نے اس کے دل و دماغ سے ہر خوبصورت شئے کو چھین لیا —— اور یہ تو نہیں کہتا کہ میں نے کچھ نہیں کیا۔ میں نے بہت سی لڑکیوں سے محبت کی ہے بلکہ یوں کہو، بہت سی لڑکیوں نے مجھ سے محبت کی۔ میں اس وادی میں ایک اجنبی کی حیثیت نہیں رکھتا۔ میں نے محبت کے گلستاں میں کئی بار قدم رکھا، محبت کے ریشمیں آنچل کے سائے میں کتنے حسین دن گزارے۔ میں مجنوں اور فرہاد کی طرح جنگل جنگل اور صحرا صحرا نہیں گھوما۔ شاید میں اس طرح کی محبت کا کبھی قائل نہ ہوا بڑی جاندار محبتیں اور بھرپور پیار کیے۔ یہ دلِ نامراد کئی بار بہت زور زور سے دھڑکا، اور کئی بار تو یہ احساس ہوا کہ وفورِ جذبات سے دل پھٹ جائے گا، یہ دل بہت مضبوط چیز ہے، انسانی جسم کا سب سے مضبوط حصّہ۔ محبت میں خوشی کا بھی احساس ہوتا ہے اور غم کا بھی۔ کئی بار تو محبت ایک مسلسل درد بن جاتی ہے، ایک ایسا درد جسے بیان کرنا مشکل ہے۔ اس درد میں ہلکی ہلکی ٹیس بھی اُٹھتی ہے اور لُطف بھی آتا ہے، آنکھوں میں آنسو بھی آتے ہیں اور کبھی کبھی اپنی حرکتوں کو دیکھ کر ہنسنے کو بھی جی چاہتا ہے۔ اس درد کی کیفیت بدلتی رہتی ہے یہ درد آندھی اور طوفان بھی بن جاتا ہے، کبھی شعلہ اور شبنم اور کبھی قاتل کی طرح بے غیرت اور بے رحم!۔

میں نے اس کا مزا چکھا ہے۔ اس درد سے آشنا ہوں۔ اب اس درد سے

دور رہنا چاہتا ہوں۔ میں نے سوچا تم سے کہہ دوں۔ کیوں میرے قتل کا سامان کر رہی ہو۔ نہ جانے کیوں میں چپ رہا۔ تمھاری طرف دیکھنے لگا۔

تم گلاب کا پھول اپنے سیاہ جوڑے میں لگا رہی تھیں۔ آنکھوں میں شوخی اور شرارت تھی۔ ان تین برسوں میں تم میں کئی اہم تبدیلیاں آئیں، تمھاری آنکھوں میں نہ التجا تھی، نہ اداسی، لہجے میں یاسیت نہ تھی۔ آواز سے لڑکپن اور سادگی غائب تھی۔ جسم پر ساڑھی الجھی الجھی نہ تھی، جسم کے ہر خم کو بے نقاب کر رہی تھی۔ اس بار یقین تھا کہ تمھارا وار خالی نہ جائے گا۔ تمھارے اٹھنے بیٹھنے، اندازِ گفتگو اور جسم کی نمائش سے خود اعتمادی جھلکتی تھی۔ تم نے سوچ سمجھ کر اور ہر چیز کو تول کر حملہ کیا تھا۔ دل لبھانے کے یہ انداز کس نے سکھائے تھے؟

میں نے اپنے آپ کو سمجھانے کی کوشش کی۔ دل کی وادیوں میں غوطہ زن ہوا۔ اور جب ابھرا تو میں نے کہا:

"اگلے سال ضرور کشمیر چلیں گے۔"

تم نے میرا جواب سنا اور خوش ہو گئیں۔ میں نے کافی سوچ سمجھ کر جواب دیا تھا۔ اگلے سال تک کون انتظار کرتا ہے۔ اس وقت ٹالنا ہی بہترین جواب ہے۔

"اچھا، میں کل شام کو چھ بجے آؤں گی۔" یہ کہہ کر تم دروازے کی طرف لپکیں دروازے سے باہر نکلتے ہوئے تم نے مڑ کر دیکھا۔ میں نے تمھاری طرف دیکھا۔ تم زیرِ لب مسکرائیں اور پھر چلی گئیں۔

اگلے دن تم ٹھیک چھ بجے آئیں۔ میری بیوی کو تم پر پورا بھروسہ تھا۔ اسی لئے اس نے تمھیں اجازت دے رکھی تھی کہ تم میرے ساتھ باتیں کر سکتی ہو۔ تم میرے سامنے والے صوفے پر بیٹھ جاتیں اور میری طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگتیں۔ تمھیں یوں اپنی طرف دیکھتے دیکھ کر میں شرما سا جاتا۔

"رمی کھیلو گے؟" تم نے پوچھا۔

"رمی نہیں آتی مجھے۔"

"آج کل تو بچے بھی رمی کھیلتے ہیں۔" تم نے چھیڑتے ہوئے کہا۔

"میں اب بچہ نہیں رہا! اور پھر اس کھیل کا شوق بھی نہیں مجھے۔"

"کون سا کھیل کھیلتے ہو؟"

"اب تو ہر کھیل سے جی بھر گیا ہے!"

"اتنی جلدی؟"

"میری عُمر کتنی ہوگی؟"

"پینتیس برس۔"

"جی نہیں۔ پینتالیس برس کا ہُوں ـــــ اور تم؟"

"اٹھارہ برس کی۔"

"کتنا فرق ہے ہم دونوں کی عُمر میں!"

"کیا ہوا؟"

"لو جی۔ ہوا ہی کچھ نہیں۔"

"یوں معلوم نہیں ہوتے ـــــ اتنی عُمر کے ـــــ کھیلو نا رمی!" تُم نے ضد کرتے ہوئے کہا۔

رمی کھیلنا سکھا دو۔" میں نے زیادہ مُوڈ بگاڑنے کی کوشش نہ کی۔ "آج سے تُم میری استاد اور میں تمہارا شاگرد ـــــ!"

تھوڑی بہت رمی تو مجھے آتی تھی۔ کچھ تم نے سکھا دی۔ اب تو ہر شام کو تم آدھمکتیں اور ہم رمی کھیلنے لگتے۔ کبھی کبھی رمی کھیلتے ہوئے میری بیوی آجاتی اور ہمیں ساتھ دیکھ کر خوش ہو جاتی۔ نہ جانے کیوں میری بیوی کو اس لڑکی کو اتنا پیار تھا۔ میری بیوی نے اس بات پہ کبھی بُرا نہ مانا کہ میں تمہارے ساتھ رمی کیوں کھیلتا ہوں اکثر میری بیوی تمہارے لیے

بھی کھانے کا یعنی اور ہم تینوں دسترخوان پر ساتھ ہی کھانا کھاتے۔ اور جب تم کھانا کھا کر چلی جاتیں تو میری بیوی کہتی :

"بہت ینگ لڑکی ہے، مجھے بے حد اچھی لگتی ہے۔ دیکھتے نہیں۔ کس سلیقے سے اُٹھتی بیٹھتی ہے۔ کتنے سلجھے ہوئے انداز میں بات چیت کرتی ہے۔ تمھاری بہت عزت کرتی ہے۔ آج سے نہیں شروع ہی سے تمھاری عزت کرتی تھی۔ تم سے بہت چھوٹی ہے نا! اور تم اس سے زیادہ باتیں کرنا پسند نہیں کرتے۔ جب پہلی بار آئی تھی، پانچ چھ برس پہلے تو اس نے پوچھا تھا" کیا کرتے ہیں تمھارے پتی ؟۔

"کہانیاں لکھتے ہیں" میں نے جواب دیا۔

"میں بھی ان کی کہانیاں پڑھوں گی۔ اس نے کہا، اور میں نے تمھاری کہانیوں کی کتاب پڑھنے کے لئے دے دی تھی۔ اس کے بعد جب کبھی میرے پاس آئی، اس نے تمھارے بارے میں پُوچھا۔ ایک بار تو میں نے تنگ آکر کہہ دیا" اری کیا پوچھتی ہو، ان کے بارے میں، جاکر مل لو! اور اس کے بعد تم سے ایک دو بار ملنے آئی۔ ہاں ایک دو بار آئی تھی۔ مجھ سے ایک بار بات نہ کی۔ ہاں ایک بار جاتے ہوئے میرے پیر چھو لئے تھے۔ مجھے اتنے بڑے سنگھاسن پر بٹھا دیا پگلی نے، میں نے کہا نا ۔۔۔ بہت عزت کرتی ہے تمھاری۔ شاید تمھیں اس کا اندازہ نہیں۔ بڑی بھولی اور پیاری لڑکی ہے "

اَب تو مجھے بھی اس کا اندازہ ہو رہا ہے۔ میں نے دل میں سوچا۔ اگلی شام کو تم پھر آئیں۔ میں پھر ری کھیلنے لگا۔ یہی سوچ کر کہ کہیں تم ناراض نہ ہو جاؤ۔ بہت عزت کرتی ہو نا میری۔ میں تم سے کیا بات کرتا۔ کبھی کبھی تم آنکھیں بند کر لیتیں اور پھر ایک دو گہرے سانس لیتیں ۔

اچانک تمھاری ناک کے نتھنے پھڑکنے لگتے اور ہونٹ لرز جاتے۔

"کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں۔" تم نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

تم مجھ سے ڈرتی تھیں۔ کھل کر بات بھی نہ کر سکتی تھیں۔ پھر بھی تم ہر شام کو آتی رہیں اور مجھے اس طرح رمی کھیلنے کی عادت پڑ گئی۔ اس کے بعد تمھیں دیکھنے کی، تمھاری شیریں آواز سننے کی ــــ اب تو جی چاہتا ہے کہ تم ہر شام میرے گھر آتی رہو ــــ اور ایک انجانے جذبے کے تحت تم اپنی آنکھیں بند کر لو۔ تمھاری ناک کے نتھنے پھڑکتے رہیں تمھارے ہونٹ لرزتے رہیں اور پیشانی پر زلفیں لہراتی رہیں۔

میں اس گلستاں میں پھونک پھونک کر قدم رکھنا چاہتا تھا۔ بڑے رنگین پھول کھلے تھے۔ بڑی دل کش اور دلنواز بہار آئی تھی۔ ایک شام کو رمی کھیلتے کھیلتے تم نے اپنا پاؤں میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے بوٹ اتار دیئے تھے۔ میرے پاؤں ننگے تھے تم نے اپنا پاؤں میرے پاؤں پر رکھ دیا۔ میں نے اپنا پاؤں وہیں رہنے دیا۔ تم نے اپنے انگوٹھے اور انگلی کے درمیانی حصے میں میرے انگوٹھے کو جکڑ لیا۔ میں نے جھٹکے سے اپنا پاؤں پیچھے سرکا لیا۔ تم پھر سنبھل کر بیٹھ گئیں۔ مجھے واقعی اس حرکت پر غصہ آیا میں جانتا تھا کہ جس وادی میں قدم رکھ رہا تھا، میں اس کا مستحق نہ تھا۔ لوگ کیا کہیں گے؟ محلے والے تو میرا جینا دوبھر کر دیں گے اور پھر میری بیوی ــــ

میں اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ دس منٹ تک وہیں بیٹھا رہا یہ سوچتے ہوئے کہ تم چلی جاؤگی۔ جب پھر کمرے میں داخل ہوا تو تم کتاب پڑھ رہی تھیں۔

"رمی نہیں کھیلوگی؟" میں نے تمھاری طرف دیکھ کر کہا۔

"جی نہیں ــــ اچھا جاتی ہوں۔"

پھر تم چلی گئیں۔ تم نے دروازے سے مڑ کر نہیں دیکھا، جیسے تم اکثر دیکھا کرتی تھیں۔

شاید تم ناراض ہو گئی تھیں۔ میں نے سوچا، چلو قصہ تمام ہوا۔

اگلی شام کو اپنی عادت سے مجبور ہو کے اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا تمہارا انتظار کر رہا تھا کہ تم ایک خوشنما اور خوبصورت ساڑھی پہنے ہوئے داخل ہوئیں۔ سفید گلاب کا پھول تمہارے سیاہ بالوں میں چمک رہا تھا۔

تم نے آتے ہی تاش میز پر رکھ دیا۔

"کہاں سے لائی ہو تاش؟"

"دیدی سے۔"

"ہو جائیں ایک دو ہاتھ۔" میں نے کہا۔

"رمی نہیں کھیلوگی۔"

"پھر تاش کیوں لائی ہو؟"

"تاکہ دوسروں کو یہ معلوم ہو کہ ہم رمی کھیلتے ہیں۔"

"رمی تو کھیلتے ہیں، اور کیا کرتے ہیں ہم؟

"میں رمی کھیلنے نہیں آتی۔"

"کیا کرنے آتی ہو؟"

"پوچھنا چاہتے ہو؟"

"ہاں!"

"میں تم سے ملنے آتی ہوں۔"

"کیوں؟" میں نے بہت روکھے انداز میں پوچھا۔

"بس جی چاہتا ہے میرا۔"

"اگر میرا جی نہ چاہے تو؟"

"مجھے اس کی پروا نہیں۔"

"میں نے محبت سے توبہ کرلی ہے۔"

"کیا بہت سی لڑکیوں سے محبت کر چکے ہو؟"

"ہاں" میں نے بے پروائی سے کہا۔

"ایک بار اور کرلو۔"

"یہ درد کون سہے۔"

"ایک بار اور سہی۔"

"کس کی خاطر؟"

"میری خاطر۔"

"تم مجھ سے بہت چھوٹی ہو، اور میں تم سے بہت بڑا ہوں عمر میں!"

"کوئی بات نہیں۔"

"آخر مجھ میں کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں — تم کسی نوجوان سے!"

"مجھے نوجوان اچھے نہیں لگتے۔"

"بنانے میں تمہیں لطف آتا ہے؟"

"سچی بات کہہ دوں؟"

"بہت بڑا احسان کروگی مجھ پر!"

"میں تمھاری پوجا کرتی ہوں۔"

"میری پوجا؟ کون سی خوبی دیکھی ہے تم نے مجھ میں؟" — میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"میں نے جب تمھیں پہلی بار دیکھا تھا۔ اس وقت میری عمر تیرہ برس کی تھی، اسی دن سے میں نے سوچ لیا تھا، میں تمھاری ہو کے رہوں گی۔

"کیوں؟"

"بچپن سے مجھے کتابیں پڑھنے کا شوق تھا، اور ابھی تک ہے۔ وہ دن میں کبھی نہیں بھول سکتی جب میں تمہارے سامنے بیٹھی ہوئی تھی اور تم نے میری طرف اس طرح دیکھا جیسے میں کچھ نہیں ہوں۔ مجھے اس دن بہت غصہ آیا اور میں خون کے گھونٹ پی کر رہ گئی۔ جب دو سال کے بعد پھر تمہارے گھر آئی، جب بھی اسی طرح تم نے مجھے دیکھا۔ جیسے میں کچھ نہیں۔ تم نے ذرا بھی لفٹ نہ دی۔ پھر میں نے تمہارے پاؤں چھوئے، تم نے ایک سادھو یا سنت کی طرح مجھے آشیرواد دی، اور کچھ نہ کہا — اتنا بھی نہ پوچھا کہ میں کیوں آئی تھی؟ کہاں جا رہی ہوں۔ کیا کام کروں گی؟ کیا میں اتنی چھوٹی اور غیر اہم تھی کہ تم مجھ سے بات کرنا بھی اپنی توہین سمجھتے تھے۔ میں پھر غصے کو پی کر رہ گئی اور جلتی بھنتی تمہارے کمرے سے چلی گئی۔ میں نے اسی دن قسم کھائی تھی کہ تمہیں اپنا بنا کے رہوں گی!"

"بہت بُرے ارادے سے آئی ہو!"

"تمہیں یقین نہیں آتا؟"

"بالکل نہیں، تم مجھے بیوقوف بنا رہی ہو!"

"تمہیں بیوقوف بنا کے مجھے کیا ملے گا؟"

"بس تمہارا جی خوش ہوگا۔"

"جی خوش کرنے کے اور بہت طریقے آتے ہیں مجھے۔ جھوٹ نہیں بولتی۔ شاید تم نہ مانو گے۔ تمہیں پانے کے لئے ہر ذلت سہہ لوں گی!"

"کیوں؟"

"بس جی چاہتا ہے کہ تم میرے ہو جاؤ!"

"اگر میرا دل نہ مانے؟"

"پہلے کوشش تو کرو۔"

"میں ہارا ہوا جواری ہوں۔ ہر پڑاؤ پر بیٹھ کر دیکھ لیا، درد کے سوا کچھ نہ ملا۔ اب تو زخموں سے چور ہو گیا ہوں!"

"ایک زخم اور سہی!" تم نے اپنی زلف کو پیشانی سے جھٹک کر کہا۔

پھر تم نے تاش بانٹ دیا۔ "کھیلتے بھی رہو تاکہ کسی کو شک نہ ہو، ہم دونوں پر۔"

"بہت چالاک ہو تم۔"

"تمھارے ساتھ کوئی چالاکی نہیں کروں گی۔ چالاک ہوتی تو تمھارے آگے اپنی ہار نہ مانتی۔ ہار اس لئے مان گئی کہ میں تمھارے ساتھ پچھلے جنم میں بھی ——"

"کون سی فلم کے ڈائیلاگ بول رہی ہو؟"

"تم مانو یا نہ مانو۔ جنم جنم کی ساتھی ہوں تمھاری! پچھلے جنم میں بھی تمھارے ساتھ تھی، اس جنم میں تمھارے ساتھ رہوں گی اور اگلے جنم میں بھی!"

"بہت لمبا چوڑا پروگرام ہے تمھارا!"

"مذاق نہ کرو —— تم عمر میں بڑے ہو مجھ سے۔ میں عمر میں چھوٹی ہوں۔ لیکن بہت ضدی لڑکی ہوں۔ جو کچھ کرتی ہوں، سوچ سمجھ کر کرتی ہوں، باقاعدہ پلان بنا کر میں روز یونہی نہیں آتی۔ میں نے قسم کھائی ہے کہ تمھیں اپنا بنا کے دم لوں گی! تم مجھے اچھے لگتے ہو۔ کیوں؟ وجہ نہ پوچھو۔ میں اتنی بری نہیں۔ کافی خوبصورت ہوں۔ خوبصورت نہ ہوتی تو کتنے نوجوان مجھ پر نہ مرتے۔ مجھ سے شادی کرنے کے لئے تیار ہو جایئے۔ لیکن میں اپنی پسند کو کیا کروں؟ تمھیں من ہی من میں اپنا سمجھ لیا ہے، تمھارے ساتھ بیٹھنا چاہتی ہوں، تم سے باتیں کرنا چاہتی ہوں۔ تم سے کچھ سیکھنا چاہتی ہوں۔ شاید تم نہیں جانتے ہم لوگ ایک گندی چال میں رہتے ہیں۔ بڑے مورکھ لوگ رہتے ہیں وہاں۔ پیار کرنا بھی نہیں جانتے۔ جب گھر سے نکلتی ہوں تو لڑکے سیٹیاں بجاتے ہیں، فقرے بازی کرتے ہیں۔ بھونڈے اشارے کرتے ہیں۔ کم بخت تمیز سے پیار کرنا بھی نہیں جانتے۔ جب تمھارے پاس آتی ہوں، تو ایک عجیب چین ملتا ہے

مجھے۔آرام سے سانس لینی ہوں ۔میں جانتی ہوں، تم مجھ سے کچھ نہ کہو گے ۔ مجھی کو سب کچھ کہنا ہوگا ـــ تُم مجھے چھیڑو گے نہیں، مجھے ہی چھیڑنا ہوگا ۔ تم مجھے چھونا پسند نہیں کرتے، مجھے ہی تمھارے پاؤں کو چھونا ہوگا ۔ اتنی سنجیدگی سے کیا فائدہ ۔ایک ہی جان ہے ، اسے ہلکان کر رہے ہو ۔میں تم سے کیا مانگتی ہوں ؟ کچھ نہیں ۔پیار کے دو بول !"

"بہت مہنگے پڑیں گے مجھے !" میں نے جواب دیا ۔

میرے لئے یہ کوئی اجنبی جذبہ نہ تھا ۔اسی لئے تو میں نے ہاں نہیں کی ۔میں سوچ سمجھ کر آگے بڑھنا چاہتا تھا ۔اگر ایک بار قدم اُٹھ گیا تو پھر واپس نہ آسکوں گا ۔کیا اس عُمر میں اتنا بوجھ اُٹھا سکوں گا ۔کیا فراق اور جُدائی کی گھڑیوں کو سہہ سکوں گا ؟ آخر ایک دن ہمیں ایک دوسرے سے الگ ہونا پڑے گا ۔ میں آغاز سے پہلے انجام کو دیکھتا ہوں ۔

دن گزرنے لگے ۔ تم ہر شام کو آتی رہیں ۔میں نے اسی دوران میں اندازہ کر لیا کہ تم مُجھ سے جھوٹ نہیں بولتیں ـــ ایک شام تو تم نے غضب ہی کر دیا ۔ایک بات ایسی کہہ دی ، جسے میں اب تک نہیں بھول سکا ـــ تم میرے ساتھ رمی کھیل رہی تھیں کہ تمھاری چھوٹی بہن نے آکر کہا :

"پتاجی نے بلایا ہے ۔"

"آتی ہوں ۔" تم نے کرخت لہجے میں کہا ۔

"پتاجی نے کہا ہے تم فوراً چلی آؤ ۔"

"دیکھ شیلا ! پتاجی سے کہہ دے ، میں اپنی مرضی سے آتی ہوں اور اپنی ہی مرضی سے یہاں سے جاؤں گی، اس وقت تو میرے فرشتے بھی مجھے یہاں سے نہیں لے جا سکتے ! اب تو جا ۔"

میں تمھاری طرف غور سے دیکھنے لگا ۔ میری نگاہوں میں حیرت کے سوا کچھ اور نہ تھا ۔

کتنے دن ہو گئے ہیں تمھیں آتے ہوئے، میرے ساتھ رمی کھیلتے ہوئے، میرے ساتھ کھانا کھاتے ہوئے، چائے پیتے ہوئے، میرے ساتھ ہنستے اور مُسکراتے ہوئے ـــــ بھلا میں کوئی خدا تھا جو تمھارے قریب نہ آتا۔ اب تو محلّے والے شک کی نظروں سے دیکھنے لگے تھے۔ اب میری بیوی بھی مجھ سے خفا خفا سی رہنے لگی تھی۔ تمہارا یہاں آنا جانا اسے اچّھا نہ لگتا تھا۔ ایک دن میں نے تم سے کہا ـــ

"محلّے والے ہمارے بارے میں عجیب عجیب باتیں کرتے ہیں۔"

"کرنے دو۔ میرے من میں کوئی پاپ نہیں۔"

"جو کچھ تم کر رہی ہو، کیا وہ پاپ نہیں؟"

"نہیں۔"

"کیسے؟"

"جو من کو اچھا لگے وہ پاپ کیسے ہوا؟"

"میری بیوی کو یہ اچّھا نہیں لگتا کہ تم ہر روز یہاں آؤ!"

"ہاں، تمھاری بیوی کی اور بات ہے۔ اس کا دُکھی ہونا مجھے بھی اچھا نہیں لگتا۔ میں دیدی سے بہت ڈرتی ہوں۔"

"لیکن اس کا حق ـــ"

"چند دن اور ٹھہر جاؤ۔" تم نے آنکھیں بند کرلیں اور گہری سوچ میں ڈوب گئیں۔

میں چُپ ہو گیا۔ میں بھی کافی آگے بڑھ گیا تھا۔ صرف پاپ اور پُن کی باتیں کر سکتا تھا۔ اس جُرم میں ہم دونوں شریک تھے۔ اب میرے لئے پیچھے ہٹنا مشکل تھا۔ میں نے تم سے کہا ـــ "اب یہاں ملنا اچھا نہیں، تم مجھ سے گھر سے باہر مل لیا کرو۔" تم مان گئیں۔

اب میں اپنی سُدھ بُدھ کھو بیٹھا۔ گیانی ہو کر اگیانی ہو گیا۔ پاپ پن کو پرکھنے والا خود پاپی بن گیا! اچھائی اور بُرائی کو ترازو میں تولنے والا، خود برائیوں کا مجسمہ بن گیا۔ مجھے کسی

کا خیال نہ رہا، نہ اپنوں کا، نہ غیروں کا۔ نہ محلّے والوں کا۔ نہ دین اور نہ دُنیا کا۔ میں نے جہاں تمھیں بُلایا، تم آئیں، جس وقت بُلایا، اسی وقت پہنچیں، میں نے جو کچھ کہا، تم نے کیا۔ اس دوران میں تم نے مجھ سے کوئی مانگ نہ کی۔

اپنا سب کچھ میرے حوالے کر دیا ــــ جسم و جان، روح، احساسات، جذبات، خیالات، اپنا دل و دماغ ــــ سب کچھ مجھے سونپ دیا۔ میں تم سے کس بات کا گلہ کرتا۔

ایسی سرشاری بہت بری ہوتی ہے۔ جب دونوں کو کچھ اور اچھا نہیں لگتا، بس دل یہی چاہتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے رہیں، باتیں کرتے رہیں۔ ایک دوسرے کی سُنتے رہیں، سُناتے رہیں۔ باہر سے کسی کی آواز تک نہ آئے۔ اُنھیں کوئی نہ جگائے۔ کوئی اُن سے نہ پوچھے تم کون ہو؟ کیا کرنے آئے ہو؟ تم اکیلے نہیں، تمھاری بیوی ہے، تمھارے بھائی ہیں، بہنیں ہیں، ماتا اور پتا ہیں۔ تمھارے اِرد گِرد لوگ رہتے ہیں، یار دوست ملنے آتے ہیں، اور تم ان سے مُنہ موڑ لیتے ہو۔ بیوی روتی ہے، چیختی چلاتی ہے، اپنے سر کے بال نوچتی ہے۔ طلاق کے لئے کہتی ہے، اور تم کچھ نہیں کہتے، کسی کی نہیں سُنتے! یہ کیسی محبت ہے کہ ہر رشتہ کو تحس نحس کرتی ہے، ہر ناطے سے مُنہ موڑ لیتی ہے، صرف اپنے لئے جیتی ہے۔ محبت بہت ہی خودغرض جذبہ ہے۔ تکمیل آرزو کے لئے اسے بے رحم اور قاتل بھی بننا پڑتا ہے، اور شاید یہی کچھ ہم دونوں نے کیا۔

ہم جذبات کی رو میں بہت دور بہہ گئے ہیں۔ میں نے کئی بار سوچا۔ میں بہت دور نکل آیا تھا، اب واپس جانے کی ہمت نہ تھی۔ میں اپنے دل پر اس کی اپنی طاقت سے زیادہ بوجھ ڈال رہا تھا۔ کسی وقت دل اتنی زور زور سے دھڑکتا کہ ایسا محسوس ہونے لگتا کہ اب غبارے کی طرح اچانک پھٹ جائے گا۔ اس وقت میں نے موت کی بھی پروا نہ کی۔ اس بہار میں موت آتی ہے تو آئے۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا، اب واپس جانا مشکل ہی نہیں ناممکن تھا۔ یہ لمحات بہت قیمتی تھے، جو میں نے موت سے لڑ کر لئے تھے۔

ہر آدمی اسی طرح سوچتا ہے کہ وہ ہمیشہ خوش رہے گا۔ لیکن اس طرح نہیں ہوتا۔ ایک شام تم نے کہا:۔

"میں کل جا رہی ہوں۔"

"کہاں؟"

"کام پر!"

"اتنی جلدی؟ کیا جی بھر گیا مجھ سے؟"

"تم سے جی نہیں بھرا ــــــ اور بھرے گا بھی نہیں۔ لیکن اب دل دُکھی سا رہتا ہے۔"

"کس لئے؟"

"دیدی کے لئے۔"

"دیدی کی اب یاد آئی؟"

"تم بھی بھول گئے تھے نا دیدی کو!"

"اپنے سُکھ کے لئے انسان سب کچھ بھول جاتا ہے۔ بہت بے غیرت اور کمین ہے یہ انسان!"

"میں تمھاری گلی سے گزر رہی تھی کہ میں نے اُوپر آنا چاہا۔ میں نے اوپر دیکھا۔ دیدی کھڑکی میں کھڑی تھیں۔ اس نے میری طرف دیکھا اور مجھے پہچاننے سے انکار کردیا۔ اب ہم ایک دوسرے کے لئے اجنبی تھے۔ دیدی نے مجھے اُوپر آنے کے لئے نہیں کہا۔ میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ میں بھی کتنی بے شرم ہوں کہ پھر بھی تم سے ملنے چلی آئی!"

"میں بھی تم سے کم بے شرم نہیں ہوں کہ میری بیوی دوسرے کمرے میں رو رہی ہوگی، اور میں تم سے باتیں کر رہا ہوں۔ خیر...... چھوڑو اِن باتوں کو ــــــ

کب لوٹوگی؟۔"

"اگلے سال!"

"اب تم نے جانے کا ارادہ کر لیا ہے تو جاؤ۔ تم بہت ضدّی لڑکی ہو۔ میرے کہنے پر یہاں نہیں ٹھہرو گی، اس لئے روکتا نہیں۔ تمھارے احسانوں کے بوجھ تلے دبا ہوا ہوں۔ کبھی موقع ملا تو ضرور اس قرض کو چکا دوں گا۔"

"اس جنم کا قرض تو شاید چکا دوگے، اگلے جنم میں کیا ہوگا؟"

"وہ اگلے جنم میں دیکھا جائے گا۔"

"پرماتما کرے ایسا ہی ہو۔"

میں نے تمھاری طرف دیکھا، تم میرے سامنے کھڑی تھیں۔ وہی پیارا پیارا سا چہرہ، تیکھے تیکھے سے نقش، بڑی بڑی روشن آنکھیں، ناک کے نتھنے پھڑکتے ہوئے کانپتے ہوئے ہونٹ، سپید ساڑی میں ملبوس۔ سُرخ گلاب کا پھول جوڑے میں لگائے ہوئے ــــ اچانک ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور تمھارے سینے سے پلّو ڈھلک گیا اور نگاہوں کے آگے ــــ

جب تم دروازے سے باہر جانے لگیں تو تم نے مُڑ کر دیکھا۔ میں نے بھی تمھاری طرف دیکھا۔ تمھاری خوبصورت آنکھوں میں مجھے آنسوؤں کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔

"اگلے سال آؤگی ــــ؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔" تم نے گردن کو جھٹکتے ہوئے کہا۔ کانوں کے بُندے گوری گوری گردن کو چومنے لگے۔

تم چلی گئیں، ایک سال گزر گیا۔ تم نہ آئیں۔ دوسرا سال بھی گزر گیا تم نہ آئیں۔ اب شاید تم کبھی نہ آؤگی! شاید تم نے دیدی کے دُکھ درد کا اندازہ کر لیا۔ تم مجھ سے بہتر انسان نکلیں اس بات کا تو مجھے اعتراف کرنا پڑے گا۔

جُدائی کے دن تو میں نے کاٹ لئے۔ کبھی کبھی رات کے اندھیرے میں تمھاری صُورت مجھے پریشان کرتی ہے۔ جو لمحات میں نے تمھارے ساتھ گذارے تھے، وہی میرا سرمایۂ حیات ہیں۔ اب میں گہرے ساگر کی طرح شانت ہوں ـــــ بس یادوں کے سہارے زندگی کے دن گزار رہا ہوں۔ تمھیں بھول چُکا ہوں۔ لیکن تمھاری تصویر ـــــ !!

سیاہ ہیرا

تین دنوں سے اسے مسلسل نیند نہیں آرہی تھی۔ وہ بے حد اداس۔ پریشان اور مضمحل تھا۔ اس کے دماغ پر ایک جنونی کیفیت سی طاری تھی۔ نہ جانے اب کیا ہوگا۔ جب کبھی اسے مسلسل تین چار دن نیند نہ آتی تو چوتھے، یا پانچویں دن ضرور وہ بیمار ہوجاتا۔ ان دنوں وہ کافی صحت مند تھا، اس لئے کسی بیماری کا بھی خدشہ نہ تھا۔ مگر یہ دماغی خلفشار اور یہ جنونی کیفیت کہاں سے آگئی۔ دماغ کی نسیں کیوں تن گئی تھیں ؟۔

رات بھر وہ جاگتا رہا۔ اس نے سوچا۔ صبح کو نیند آئے گی، مگر نیند آتے آتے نہ آئی۔ مسلسل جاگنے سے اس کا سارا جسم دکھنے لگا۔ آنکھیں جلنے لگیں۔ کھلی ہوئی کھڑکی سے ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا۔ اور اس کا سارا جسم خزاں کے پتّے کی طرح لرزنے لگا۔ اتنی سخت سردی پڑ رہی تھی۔ یہ لوگ اس سردی سے پناہ مانگنے لگے۔ تقریباً پچیس سال کے بعد ایسی یخ بستہ صبح آئی۔

شاید اسی سردی کی وجہ سے اسے نیند نہیں آرہی تھی۔ اس نے صبح کا اخبار اٹھایا۔ اور جلتی ہوئی آنکھوں کو ملتے ہوئے پہلے صفحہ پر نگاہ دوڑائی۔ سرخی پڑھتے ہی ایک شدید

جھٹکا سا لگا۔ ایسا محسوس ہوا۔ جیسے اس کے سینے میں کسی نے گولی ماردی۔ وہ پوری سُرخی پڑھنا چاہتا تھا۔ اور اس کی تفصیل بھی۔ مگر وہ محض ایک نظر پڑھ کر رک گیا۔ آنِ واحد میں اس کا دل ڈوبنے لگا۔ پیشانی پر پسینے کے قطرے نمودار ہو گئے۔ نبض کی رفتار سُست سی پڑ گئی۔ دم گھٹتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ اور وہ نیم جان سا ہو گیا۔ ایک لمحہ کے لئے اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ ہاں اب اس کا آخری وقت آگیا تھا۔ یہ تو دل کے دورے کا آغاز تھا۔

چار سال پہلے اُسے دل کا دورہ پڑا تھا۔ اور وہ مشکل سے اس حملے سے بچا تھا۔ کاش وہ اس سُرخی کو نہ پڑھتا۔ کاش یہ سُرخی اس اخبار کے پہلے صفحہ پر نہ چھاپی جاتی۔ اس نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا، جو سٹوو پر چائے تیار کر رہی تھی۔

اب وہ آہستہ آہستہ مر رہا تھا۔ اس ٹھنڈی یخ بستہ صبح۔ اپنے بستر پر اپنی بیوی کے سامنے۔ اس نے بات کرنے کی کوشش کی، مگر آواز گلے میں اٹکی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس کا دل ڈوب رہا تھا۔ اس نے پُوری قوت کے ساتھ موت سے لڑتے ہوئے نحیف آواز میں کہا:

"فوراً ایک کپ چائے دو!"

مرنے سے پہلے ایک کپ پینا چاہیئے۔ حلق میں گرم گرم چائے، اور اکھڑتا ہوا سانس. دُھندلے دُھندلے سائے۔ ڈوبتا ہوا دل۔ نحیف و کمزور آواز۔ ہاتھ ہلانا چاہو تو نہ ہل سکے۔ گلا خشک ہوتا جا رہا تھا۔ اس میں ضبط کا مادّہ ضرورت سے زیادہ تھا۔ اس نے سوچا۔ چلاّنا بے سود ہے۔ اس نے اپنی بیوی کو اپنے دل کی کیفیت بتانے کی کوشش نہ کی۔ کیونکہ اگر اس نے اپنی بیوی سے یہ کہہ دیا کہ وہ مر رہا ہے، اس کی بیوی فوراً رونا دھونا اور چلاّنا شروع کر دے گی۔ اسی شور و شغب میں اس کی موت ہو جائے گی۔

اچانک ہارٹ فیل ہوتا ہے تو ہو جائے۔ اگر یوں موت آتی ہے تو آئے۔ اس

نے قمیض سے پسینے کو پونچھتے ہوئے سوچا۔ محض ایک سُرخی پڑھنے کے بعد دل کا دورہ۔ ایسے دل کا فیل ہو جانا ہی بہتر ہے۔ ان حالات میں اس کا زندہ رہنا بے سود تھا۔ اسی عرصے میں اس کی بیوی نے ایک چھوٹی سی تپائی پر چائے کی پیالی رکھی۔ اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے پیالی اٹھائی، اور سرد لبوں سے گرم گرم چائے کو چھُوا۔

ایک گھونٹ گرم گرم چائے پینے سے ذرا سی تسکین ملی۔ اس کی نگاہ پھر اخبار کی طرف گئی۔ اس کا دل اور ڈوبنے لگا۔ جلدی سے اس نے چائے کا ایک اور گھونٹ پیا۔ وہ چائے پی کر سُرخی پڑھے گا۔ سُرخی پڑھ کر وہ کیا کرے گا، جو کچھ ہونا تھا۔ وہ ہو چکا۔ تفصیلات میں جلنے سے کیا فائدہ۔ اسے دوبارہ اس سُرخی کو پڑھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ موت اور زندگی کے دوراہے پر کھڑے ہو کر اس کے ذہن نے بیس برس کی طرف زقند لگائی جب وہ نویں جماعت میں پڑھتا تھا، اور اس کی ماں نے اسے سبزی لانے کے لئے بازار بھیجا تھا۔ اس وقت سُورج غروب ہو چکا تھا۔ لاہور کی تنگ و تاریک گلیاں اندھیرے میں ملفوف تھیں۔ جب وہ گھر سے نکل کر چوک متی پہنچا۔ تو اسے معلوم ہوا کہ بھگت سنگھ کو پھانسی پر چڑھا دیا گیا۔ اس نے اس سے پہلے بھگت سنگھ کو کہیں نہیں دیکھا تھا۔ اخباروں میں اس کی تصویریں، اور بیان پڑھے تھے۔ جس طرح سے اس نے اپنی ماں کو دیکھا تھا۔ یا اپنی بہن یا بھائی کو۔ بالکل اسی طرح اس نے بھگت سنگھ کو کبھی نہیں دیکھا۔ اس کے باوجود اس نے محسوس کیا کہ وہ بھگت سنگھ کو ایک عرصے سے جانتا ہے۔ اس کی آواز کو پہچانتا ہے۔ اسے کہیں نہ کہیں ضرور دیکھا ہے۔

یہ خبر سُنتے ہی اس کا خون کھول اُٹھا۔ وہ واپس گھر جانے کے بجائے سیدھا آگے بڑھتا گیا سڑکوں، دوکانوں، چوراہوں پر لوگ کھڑے تھے، اور ایک جلوس کی شکل میں انار کلی کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ہر شخص کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ چہرے غصّے اور نفرت سے تمتما اُٹھے "یہ پھانسی نہیں تھی،، سب نے مل کر کہا۔ "یہ قتل ہے قتل،، بھگت سنگھ زندہ باد" کے نعروں سے ساری فضا گونج اُٹھی۔ زندگی میں پہلی بار اس نے پورے ہجوم کو مشتعل

دیکھا۔ لوہاری دروازے سے لے کر انار کلی کے آخری سرے تک ہزاروں انسانوں کا ہجوم ایک دیو قامت پیکر کی طرح آگے بڑھ رہا تھا، ہر طرف سے بھگت سنگھ زندہ باد" کے نعرے بلند ہونے لگے۔ آج پہلی بار اس نے عوامی طاقت کو ایک لاوے کی طرح بپھرے ہوئے دیکھا۔ آتش فشاں پہاڑ پھٹ چکا تھا، اور اس کا اُبلتا ہوا سیال۔ شیر کی طرح مُنہ پھاڑے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا۔ کہیں کوئی سفید نسل کا انسان نظر آجائے تو اُسے کچّا ہی چبا جائیں مگر ساری انار کلی۔ سارا نیلا گنبد اور ساری مال روڈ پر گورا سپاہی نظر نہ آیا سب کے سب اپنے اپنے بلوں میں گھس گئے تھے۔

جلوس آنکھوں سے شعلے برساتا ہوا۔ چیختا، چلّاتا، دہاڑتا ہوا، غصّے سے تنا ہوا۔ بپھرا ہوا۔ دریائے راوی کی طرف مُڑا۔ اور وہ بھی اپنے والدین کے غصّے سے بے نیاز ہو کر جلوس کے ساتھ ہو لیا۔ دریائے راوی کے کنارے بھگت سنگھ کے والد اس سنگین قتل پر تقریر کریں گے۔ کتنا بڑا وہ باپ ہو گا، جو اپنے بیٹے کی لاش پر آنسو نہیں بہائے گا، بلکہ عقیدت کے پھول چڑھائے گا۔ یہ سوچ کر اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور دم گھٹنے لگا۔

سارے راستے میں کوئی انگریز نہ ملا۔ کوئی گورا سپاہی نہ ملا بس لوگوں کا ایک بے پناہ ہجوم غصّے سے بپھرا ہوا، نفرت کے شعلے برساتا ہوا، آگے بڑھ رہا تھا۔ اس طوفان کے آگے ٹھہرنا مشکل تھا۔

وہ ساری چائے پی گیا۔

کھڑکی سے باہر سورج کی کرنیں ٹین کی چھت پر لرزاں تھیں۔ اور فٹ پاتھ پر ننگ و دھڑنگ بچّے سردی سے بچنے کے لئے دھوپ سینک رہے تھے۔ وہ بیحد غمگین اور افسردہ تھا۔ اتنا بے بس۔ اتنا کمزور اتنا نحیف اس نے اپنے آپ کو کبھی محسوس نہ کیا۔

یہ کون تھا۔ جسے وہ اپنا سمجھ رہا تھا۔ اپنا کیا ہوتا ہے۔ اپنا کون ہے۔ غیر کسے کہتے ہیں۔ اور کیوں کہتے ہیں؟ کیا وہ اس کا بھائی تھا۔ کوئی رشتہ دار تھا۔ اس کا دوست تھا۔

یا کوئی واقف کار! یا اس کے دیش کا کوئی رہنما۔ اس قسم کا کوئی رشتہ دار نہ تھا۔ آخر وہ اداس کیوں تھا۔ چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ دل ڈوب رہا تھا۔ نبض کی رفتار سست تھی۔ آخر اس شخص سے اس کا کیا رشتہ تھا۔ وہ اپنے گڈمڈ خیالات کا صحیح طور پر تجزیہ نہ کر سکا۔ رہ رہ کر ایک عجیب سی صورت اس کے سامنے آتی۔ ایک نہایت معصوم سا چہرہ۔ بے گناہ۔ متین۔ سنجیدہ صورت اس کے سامنے آتی اور اس کے دل کو مغموم اور افسردہ بنا دیتی۔

آج سے تیرہ برس پہلے۔ جب وہ نئی بش شرٹ پہن کر باہر جانے کے لیے تیار ہوا تھا۔ کہ اسے گاندھی جی کے قتل کی خبر ملی۔ اسی کمرے میں۔ اسی گلی میں۔ اسی بازار میں۔ اسی شہر میں۔

جس شخص نے اس خبر کو سُنا۔ اس کا کلیجہ دھک سے کر کے رہ گیا۔ خبر سُنتے ہی وہ دم بخود سا گیا۔ گاندھی جی کو کس نے قتل کیا؟ قاتل ہندو تھا یا مسلمان۔ سکھ یا عیسائی۔ کیا اس قتل میں بیرونی طاقتوں کا ہاتھ تھا۔ یا دہشت پسندوں کا۔ کس بدنصیب نے اس عظیم ہستی کے خون سے ہاتھ رنگے تھے۔

وہ دن بڑا منحوس اور بدصورت تھا۔ وہ رات بڑی بھیانک اور وحشت ناک تھی۔ وہ رات تو قیامت کی رات تھی۔ اتنی افسردہ۔ اتنی مغموم۔ اتنی سیاہ۔ اداس رات اس شہر پر کبھی نہ اُتری تھی۔ ہر طرف ایک سناٹا، خاموشی ہر طرف شرمسار نگاہیں۔ اور اداس چہرے نظر آتے تھے، وہ اس رات بھی نہ سو سکا۔

آج رات بھی نیند نہیں آئے گی۔ گاندھی جی کو سب جانتے تھے۔ حتیٰ کہ اس کی اَن پڑھ بیوی بھی جانتی تھی، وہ گاندھی جی کی موت کی خبر سن کر رونے لگی۔ ہر شخص دوسرے کے غم میں شریک تھا۔ مگر اس وقت وہ کیا بتائے۔ وہ اپنی بیوی سے کیا کہے۔ اس کی بیوی تو مقتول کے نام سے واقف نہیں۔ کون مارا گیا تھا۔ کس کا خون بہایا گیا تھا۔ اور وہ کیوں مارا گیا۔ کس نے کس کا خون کیا تھا۔ وہ کیا بتائے؟"

اِتنے میں اس کا دوست شنکر کمرے میں داخل ہوا۔ ہاتھ میں اخبار لئے ہوئے اور سامنے والے پلنگ پر بیٹھ گیا۔ شنکر کا رنگ بھی سیاہ تھا معصوم چہرہ۔ ذہین آنکھیں۔ سفید دانت۔ اسے بھی کچھ معلوم نہیں۔ سارا اخبار پڑھ ڈالا، مگر اسے بھی کچھ علم نہیں کہ کس کا قتل ہوا۔

شنکر ایک فیکٹری میں ملازم تھا۔ اور اس کے گھر اکثر آتا جاتا۔ کیا وہ شنکر کو بتائے؟ وہ کیا بتائے۔ اُس سے کیا فائدہ ہوگا۔ وہ اپنے دل کے بوجھ کو ہلکا کرنا چاہتا تھا۔ وہ اُسے بتانا چاہتا تھا۔ کہ یہ سُرخی کس کے خون سے لکھی گئی۔ اگر شنکر نے بات نہ کی تو وہ واقعی پاگل ہو جائے گا۔ اس کے دماغ کی رگیں تن کر پھٹ جائیں گی، اور دل کا دھڑکنا اچانک بند ہو جائے گا۔

اس نے شنکر کو عجب تشنج کی حالت میں دیکھا۔ اچانک شنکر نے کہا:

سب کچھ بے سود ہے۔ ہر چیز بے کار ہے۔ سب کچھ جھوٹ ہے ہر چیز نقلی ہے۔"

شنکر نے غصّے سے اخبار کو فرش پر پھینک دیا۔

"کیا جھوٹ ہے؟" وہ بولا۔

"وہ اسے بچا سکتے تھے۔" شنکر نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ پھر اس کی بھویں تن گئیں، اور ہاتھ کی مٹھیوں کو بھینچتے ہوئے کہنے لگا۔ "وہ اُسے حراست میں لے سکتے تھے۔"

"وہ اسے حراست میں لے سکتے تھے۔"

"وہ کون تھا۔ وہ اسے حراست میں لیتے۔ وہ اس کا کون تھا؟" وہ بڑبڑایا۔

وہ کچھ عرصہ خاموش رہا۔ جیسے شنکر پر ان چند جملوں نے اس پر جادو سا کر دیا ہو۔ شنکر اسے جانتا ہے۔ کیا یہ کافی نہ تھا۔ اے دل۔ ذرا ٹھہر جا۔ وہ لیٹا ہوا تھا۔ پھر اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کے جسم میں آہستہ آہستہ توانائی آنے لگی۔ ڈوبتے ہوئے دل کو ایک سہارا مل گیا۔ نبض کی رفتار تیز تر ہوتی گئی۔ غصّے سے کنپٹیاں جلنے لگیں۔

شنکر جانتا تھا کہ کس کا قتل ہوا۔ شنکر کو معلوم ہے۔ صرف معلوم ہی نہیں وہ بے حد خفا

تھا۔ صرف خفا ہی نہ تھا، اس کی آنکھوں سے شعلے برستے تھے۔ شنکر کوئی لیڈر یا دانشور نہ تھا۔ کسی پارٹی کا ممبر نہ تھا، محض ایک عام انسان۔ ایک عام کامگار۔

جس ذہنی خلفشار سے وہ دوچار تھا۔ جس غم اور غصے کی لہر سے وہ ہمکنار تھا۔ اس میں وہ اکیلا نہ تھا۔ اس احساس نے اس کے سارے جسم میں ایک برقی لہر سی دوڑا دی۔

اس نے شنکر کی طرف دیکھا۔ شنکر غصے سے بھرا بیٹھا تھا۔ اس کے اپنے جسم میں غصے کا طوفان لہریں مارنے لگا۔ نحیف و کمزور آواز۔ فیکٹری کے بھونپو کی طرح گونجنے لگی۔ وہ کیا کرے۔ وہ کہاں جائے۔ وہ کس سے کہے۔ کہ اس کے ہاتھ میں ایک بندوق دے دو، وہ ان کو قتل کر دے گا۔ ان سب کا گلا گھونٹ دے گا۔ ان سب کی بوٹی بوٹی نوچ ڈالے گا۔

ہاں۔ اس کے ہاتھ میں ایک پستول یا رائفل ہونی چاہیے۔ وہ سوچتا گیا۔ اور اس کے دماغ کی نسیں تنتی گئیں۔ اس کے دل کی دھڑکن سارے جسم میں سنائی دینے لگی۔ اور سارے جسم میں خون ایک وحشی راگ گانے لگا۔

غصے کی لہر پر لہر آ رہی تھی۔ اور دل کی چٹان سے یہ غضب ناک لہریں یکے بعد دیگرے ٹکرا رہی تھیں۔ اس وحشی راگ کے زیر اثر اس کی آنکھوں کے سامنے ایک عجیب سی دھند چھا گئی۔ اور اس دھند میں ایک چہرہ سیاہ ہیرا کی طرح چمکتا ہوا نظر آیا۔ کوئلے کی طرح سیاہ اور کالا۔ روشن روشن سی آنکھیں۔ ناک پر عینک۔ رخساروں کی ہڈیاں ذرا ابھری ہوئیں۔ چہرہ ایک معلم کی طرح پُر وقار اور سنجیدہ۔ دودھ میں نہائے ہوئے سفید سفید سے دانت۔ اتنا معصوم اور شریف چہرہ۔ کہ ہر مذہب کا ہر خدا بھی تعظیم و تکریم کے ساتھ اس چہرے کے آگے دو زانو ہو جائے۔

اس نے اس چہرے کو صرف اخبار میں دیکھا تھا۔ اس نے اس کے ملک کو نہیں دیکھا۔ اس ملک کی ہوائیں۔ اس کے نیلے آسمان۔ اس کے رہنے والوں، اور اس کی مٹی کی خوشبو سے بھی وہ ناواقف تھا۔ اس کی تہذیب و تمدن سے کوئی علاقہ نہ تھا۔

مگر نہ جانے وہ اس دیانت دار مُسکراہٹ اور پر وقار چہرے سے کیسے اور کیوں مانوس تھا۔ اس نے اپنے آپ کو بہت سمجھانے کی کوشش کی، دل کو بہلانے کے لاکھ جتن کئے۔ اس قتل کو ذہن سے نکالنے کی ہزار ترکیبیں کیں، مگر ہر ترکیب بے کار ثابت ہوئی۔ اس نے دل سے کہا۔ "تمھارا مقتول سے کیا رشتہ ہے۔ ہر روز قتل ہوتے ہیں اور تُم کبھی افسردہ اور غمگین نہیں ہوئے۔ آخر اس قتل میں کیا رکھا ہے اس کے متعلق سوچنا بے کار تھا۔ مگر رہ کر اسے اپنے آپ پر غصہ آرہا تھا۔ وہ آپے سے باہر ہو رہا تھا۔ اپنے آپ کو سمجھانے کے باوجود بھی اس نے محسوس کر لیا کہ اس وقت کمرے میں ٹھہرنا درست نہیں۔ اگر چند منٹ اور بیٹھا رہا تو وہ ضرور پاگل ہو جائے گا۔

اس نے سامنے والے پلنگ پر نگاہ ڈالی۔ شنکر نہ جانے کس وقت کمرے سے باہر نکل گیا۔ وہ بھی کمرے سے باہر نکل گیا۔ چلتے چلاتے وہ مختلف جگہوں پر ٹھہرا۔ پہلے ایک ریستوران میں داخل ہوا۔ لوگ اسی قتل کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے، لوگ اسے جانتے ہیں۔ مرنے والا اجنبی نہیں تھا۔ یہ جان کر اسے تسکین ملی۔ وہ بس میں بیٹھا، لوگ قاتل کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔

وہ ٹرین میں بیٹھا، لوگ وہاں بھی مقتول کے متعلق باتیں کر رہے تھے۔ اس نے ٹرام میں بیٹھ کر اپنا غم غلط کرنے کی کوشش کی۔ وہاں بھی دُبلے پتلے لوگ۔ گندے کپڑوں میں ملبوس، اس قتل کا چرچا کر رہے تھے۔

دھیرے دھیرے اس کے دل کو تسکین مل گئی۔ نہ جانے کیوں؟

وہ اس غم اور غصّے کے طوفان میں اکیلا نہ تھا۔ لوگ اسے جانتے تھے۔ وہ کیوں مارا گیا۔ کس نے مارا کس نے خون کیا۔ کس کا خون بہا تھا اس احساس سے اُسے اور تقویت ملی۔ غصّے اور نفرت کے طوفان میں متانت اور سنجیدگی کا ایک ہلکا سا جھونکا آیا۔ مگر وقتی طور پر۔ وہ جانتا تھا، ایک سفّاکانہ قتل ہوا تھا۔ ایک نیٹ کلین مرڈر۔

ہچ کاک کے الفاظ میں جو SUSPENCE سنگدلانہ قتلوں کا بہترین نباض تھا۔
ہچ کاک اس قتل پر ضرور فلم بنائے گا۔ اس سے بہتر اور کیا مرڈر مسٹری ہو سکتی ہے۔
اس کا قاتل کون تھا۔ کسی کو معلوم نہیں۔ مقتول جیل سے کیسے بھاگا۔ کس نے قتل کیا
کوئی نہیں جانتا۔ اس سے بہتر پلاٹ کہاں سے ملے گا؟۔

مگر ہچ کاک اس پر فلم نہیں بنائے گا۔ کیوں کہ یہ سیاسی قتل ہے۔ آرٹ اور فن سے بے بہرہ۔ اس قتل میں کسی دوشیزہ کے زلف کے کوئی پیچ و خم نہیں۔ کوئی حسین اور لطیف شے نہیں۔ کسی عورت کے دلفریب دلکش نیم وا لب نہیں۔ نہ عورت کا بے داغ مرمریں سینہ۔ نہ سڈول اور گداز بازو۔ نہ عورت کی بے وفائی اور مکاری کا ذکر۔ نہ کوئی غیر فانی اور ابدی جذبہ۔ اس موضوع پر فلم بنانا۔ نظم یا افسانہ لکھنا۔ فن اور کلا کی توہین کرنا۔

اس نے سوچا۔ کہ وہ اپنے ذہن سے اس قسم کے خیالات کو ہمیشہ کے لئے مٹا دے گا۔ اور آج کی رات یہ سوچ کر سکھ اور چین کی نیند سوئے گا کہ وہ جس کا نام پیٹرس لومبا بائیبل تھا۔ نہیں مرا۔ پیٹرس لومبا کے نام کا کوئی آدمی اس دنیا میں پیدا نہیں ہوا۔ دنیا کے نقشے میں کانگو کوئی دیش نہیں۔ کیا ہم اتنی چھوٹی سی بات نہیں سوچ سکتے۔ ہم جو اتنی بڑی باتیں سوچتے ہیں، ہم جن کے ادب پر آفاقیت کی مہر ثبت ہے۔ کیا ہم یہ بھی نہیں سوچ سکتے، کہ لومبا کی کوئی بیوی نہیں۔ اس کا کوئی بچہ نہیں۔ ہاں لومبا نہیں مرا۔ بچارے کا ہارٹ فیل ہو گیا۔ اس نے اپنے آپ کو خود مار لیا۔ وہ غدار تھا۔ ہاں یہی سوچ کر سو جانا چاہیئے۔ " اور میں بھی یہی کہتا ہوں۔ کہ لومبا نہیں مرا۔ بلکہ میں یہ کہتا ہوں۔ کہ لومبا نہیں مرے گا۔ یہ درست ہے۔ جو کچھ میں کہتا ہوں۔ یہ پراپیگنڈہ ہے۔ مگر یہ پراپیگنڈہ بائیبل کی طرح غیر فانی ہے۔ گیتا کی طرح امر ہے اور قرآن کی طرح مقدس ہے۔

آج پھر شب آنکھوں میں خون کا کاجل لگائے ہوئے اس دھرتی پر اُتری ہے۔ آج کی رات بڑی بھاری۔ ٹھنڈی۔ سیاہ اور یخ بستہ ہے۔ آج کی رات فولاد کی طرح کٹھور اور سخت ہے۔ آج اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ دل میں اداسیوں نے آشیانہ بنا لیا تھا، مگر کل کی رات ایسی نہ ہوگی!!۔

چھنال

یوں تو امرت ورما کی بیوی سے مل کر مجھے بے حد مسرت ہوئی۔ ملاقات تو پہلی تھی، مگر ذہن پر یہ چھوٹی سی ملاقات اَن مٹ نشان چھوڑ گئی۔ دیکھنے میں اوشا ورما بے حد حسین تھی۔ سرو قد۔ کالے سیاہ بال کندھوں پر لٹکے ہوئے، جیسے کالی سیاہ رات کسی جگمگاتے ہوئے جزیرے پر اُتر آئے۔ آنکھیں ذہین، اور بڑی بڑی۔ ناک ستواں۔ نتھنے حساس۔ ہونٹ پتلے اور یاقوت کی طرح سُرخ، اور ان کے کونے لرزتے ہوئے۔ چہرے اور باہوں کی جلد بے حد شفاف اور صاف جسم کے خطوط پُر کشش اور جاذب نظر، جس پر ایک بار نگاہ ڈالے تو سارا جسم لرز لرز جائے۔

یوں تو دوست کی بیوی کی اتنی تعریف نہیں کرنی چاہیے۔ لوگ غیروں کی تعریف زیادہ کرتے ہیں۔ اپنوں کی کم، میں تو انگریزی زبان کے مقولے کے مطابق اس بات پر یقین رکھتا ہوں کہ ــــ "خیرات گھر سے شروع کیجیے، چاہے وہ سکوں کی خیرات ہو یا تعریفی جملوں"۔

اوشا ورما میرے گھر میں کیا وارد ہوئی کہ چند ہی دنوں میں ساری بلڈنگ میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ میں غیروں کی پرواہ کم کرتا ہوں، اپنوں کی زیادہ۔ مجھے اپنی بیوی پر

پورا بھروسہ تھا کہ وہ ایک خوش شکل اور حسین صورت کو دیکھ کر بے حد خوش ہو گی۔ گو میں اپنی بیوی کی عادت سے بخوبی واقف ہوں کہ جب کبھی کوئی بدصورت عورت اس سے ملنے آئی۔ اس نے ہمیشہ میرا تعارف کرادیا۔ اور بدقسمتی سے کوئی حسین لڑکی یا عورت نے اس گھر کی طرف رُخ کیا تو اس نے ہمیشہ میرے گھر کا دروازہ بند پایا۔

اوشا ورما صرف آئی ہی نہیں تھی، بلکہ دو ماہ اسے اس گھر میں ٹھہرنا تھا آج کل اس کا خاوند لندن میں بحیثیت انجینئر کام کرتا تھا۔ اوشا ورما کے پاس پاسپورٹ نہ تھا۔ پاسپورٹ حاصل کرنے کے لئے جتنی دوڑ دھوپ کرنی پڑتی، اس کا علم میری بیوی کو نہ تھا۔ جنت کا پاسپورٹ بڑی آسانی سے مل سکتا ہے، مگر لندن کا پاسپورٹ حاصل کرنا، جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔

اوشا ورما صرف حسین ہوتی تو شاید یہاں کے لوگ اسے نظر انداز کر دیتے یہاں تو معاملہ ہی اور تھا۔ ایک خوبصورت چہرے اور جسم کے علاوہ، وہ فیشن کی دلدادہ تھی۔ بس سونے پر سہاگہ والی بات تھی۔ نت نئے فیشن بھی موسموں کی طرح بدلتے رہتے ہیں کبھی کالی گھٹا کی طرح تیز اور تند۔ کبھی موسمِ بہار کی طرح دلفریب۔ شوخ و شنگ۔ کبھی رنگ مدھم مدھم سا ہے، تو کبھی نگاہوں کو خیرہ کرنے والا۔

آج چُست شلوار اور تنگ قمیص پہننے کا رواج ہے، تو کل کھلے جمپر اور کھُلے پائینچے کا۔ اگر آج ہونٹوں پہ یاقوت کی طرح لپ اسٹک لگی ہوئی ہے، تو کل ہلکی نیم گلابی سی لپ اسٹک لگائی جائے گی، جس سے شاید موسمِ بہار کا اندازہ نہ ہو سکے، بلکہ خزاں کی آمد کا پتہ چلے۔

اوشا ورما تو ماشاء اللہ چست پینٹ بھی پہنتی تھی۔ کبھی کبھار جب تنگ بلاؤز اور پینٹ پہن لے تو بلڈنگ میں قیامت برپا ہو جاتی۔ محلے والے اس کی طرف یوں دیکھتے جیسے آزادی آج ہی ملی تھی۔ یہ لوگ اس کے حسن سے ہی بدظن نہ تھے بلکہ اس کی بات چیت، اس

کے اندازِ گفت گو اور دیگر عادتوں سے بے حد نالاں تھے۔

اوشا ورما بیویوں کو چھوڑ کر بچّوں اور بیویوں کے خاوندوں سے بڑی جلدی بے تکلف ہو جاتی۔ کسی کے بچّے کو اٹھا کر چوم لیتی۔ کسی کو لالی پاپ دیتی۔ کسی کے خاوند کو ہیلو کہتی۔ کسی کو نمستے، کسی کو سلام۔

مجھ سے وہ بڑی جلدی گھل مل گئی۔ آٹھ دس دنوں کے اندر اندر وہ مجھ سے یوں باتیں کرنے لگی، جیسے وہ مجھے برسوں سے جانتی تھی۔ یوں تو میں چوڑیوں کا بیوپار کرتا ہوں۔ کلیان میں ایک چھوٹی سی فیکٹری ہے۔ وہیں چوڑیاں بنتی ہیں۔ نت نئے ڈیزائن تراشتا ہوں، اور اپنی جمالیاتی حس کو چوڑیوں میں ڈھالتا ہوں۔ شاعرانہ مزاج رکھتا ہوں، رنگ روپ کا پجاری ہوں اور حسن کا بھکاری ہوں۔ اس لئے میری بیوی میرے بارے میں غلط فہمی میں مبتلا ہے کہ میں دل پھینک عاشق ہوں۔ دراصل میں اتنا بد مزاق نہیں ہوں کہ دل کو بغیر سوچے سمجھے نذرِ عشق کر دوں۔ بڑی انمول چیز ہے۔ سوچ سمجھ کر کسی کے حوالے کرتا ہوں، تاکہ دلِ ناداں کی بے عزّتی نہ ہو۔

اگر اوشا ورما نہ آتی تو مصیبتوں سے دو چار نہ ہوتا۔ یہ مثل تو آپ نے سُنی ہوگی کہ ایک میان میں دو تلواریں نہیں سما سکتیں۔ بالکل اسی طرح دو عورتیں ایک چھت کے نیچے نہیں رہ سکتیں۔ میری بد قسمتی کا آغاز اس وقت سے شروع ہوا جب میں نے اوشا ورما کے ساتھ باہر جانا شروع کیا۔ دراصل پاسپورٹ بنوانے میں دوڑ دھوپ کرنی پڑتی ہے میں اپنی بیوی سے کیا کہتا، کہاں جانا پڑے گا؟ کس کس سے ملنا ہوگا؟ چند دنوں تک تو میری بیوی نے اس صدمے کو برداشت کر لیا۔ مگر ایک دن اس کی قوتِ برداشت نے جواب دے دیا، اور میری ڈارلنگ مجھ پر برس پڑی۔

"تم نے ہر روز اس کے ساتھ باہر گھومنے چلے جاتے ہو۔ شرم نہیں آتی؟"

"وہ میرے دوست کی بیوی ہے۔ شرم تمھیں آنی چاہئے، جو میرے ایسے باوقار

آدمی پر تہمت لگا رہی ہو۔"

"ہاں، ہاں میں جانتی ہوں، تم کتنے پاک باز ہو۔ ابھی پچھلے سال ہی تم نے اُس لڑکی کو......"

"ارے آہستہ بات کرو! کوئی سن لے گا تو کیا کہے گا!؟"

"جیسے لوگوں کے آنکھیں نہیں! کان نہیں!! سب میری طرح بدھو ہیں نا؟ کل سے تم اس کے ساتھ نہیں جا سکتے!"

"تو اس کا پاسپورٹ کیسے بنے گا؟"

"خود بنوا لے!"

"لوگوں سے ملنا پڑتا ہے۔ ذرا سوچ سمجھ کر بات کرو۔ اکیلی جان اتنا سب کچھ کیسے کرے گی؟"

"جی ہاں وہ تو بچی ہے۔ ابھی تو اس نے چلنا پھرنا سیکھا ہے؟ دیکھتے نہیں محلّے کے سارے مردوں سے کھُلم کھُلا باتیں کرتی ہیں۔ غریب مرد لندن میں مارا مارا پھرتا ہے۔ یہ لونڈیا یہاں عشق کرتی ہے ـــــ اجی جس کا مرد لندن میں رہے۔ اس کا کھانا ہضم نہیں ہونا چاہیئے۔ یہ دن رات مزے سے گلچھرے اُڑاتی ہے۔ بہترین کپڑے پہننے۔ چہرے پر پوڈر اور ہونٹوں پر لپ اسٹک لگا کر دندناتی پھرے۔ کل سے تم....."

"بات تو سُنو!"

بات کیا سُنوں؟ محلّے کی ساری عورتیں کہتی پھرتی ہیں کہ تیری جیسی معصوم اور بھولی عورت کوئی نہیں۔ غیر عورت کے ساتھ اپنے مرد کو جانے کی اجازت دے رکھی ہے، تم تو بگڑی ہو بگڑی! ایسی چھنال عورتوں سے بچے رہنا چاہیئے۔ مرد کا کوئی ٹھکانا ہوتا ہے۔ مرد ایک جوتا اُتارتا ہے دوسرا پہنتا ہے۔ کل وہ تمہیں کو لے اُڑے تو میں کیا کروں گی؟"

"کیسی اُلٹی سیدھی باتیں کر رہی ہو؟ ستی ساوتری ایسے جملے مُنہ سے نہیں

نکالنے چاہئیں۔ ہندو استری کے لئے پتی پرماتما کے سمان ہوتا ہے، اور تم اپنے پتی پر بھروسہ بھی نہیں کرتیں؟"

"بھروسہ گیا بھاڑ میں، میں اپنے خاوند کو دوسروں کے حوالے کردوں؟ اپنے ہی پیروں پر خود کلہاڑی ماروں۔؟ میں اتنی بھولی اور معصوم نہیں ہوں جی!"

"دیکھ رکمنی: خدا کے لئے میرے دوست کی توہین نہ!! میں پرماتما کی قسم کھا کر کہتا ہو کہ میرے دل میں کسی قسم کا کوئی پاپ نہیں۔ وہ بچاری پاسپورٹ بنوالے پھر دیکھ لینا میں اسی دن اسے ہوائی جہاز پر سوار کرادوں گا ذرا دھیرج اور صبر سے کام لے۔"

"میں تو چھاتی پر پتھر رکھ لوں گی، مگر اس بلڈنگ کے لوگ اس چھنال عورت سے بے حد تنگ ہیں۔"

دراصل بیویوں کو سمجھانا ایک احمقانہ فعل ہے۔ میں خاموش ہوگیا۔ اس شام جب اوشا ورما گھر میں داخل ہوئی تو وہ بے حد خوش تھی۔ دائیں ہاتھ میں ایک بیگ تھا، جس میں آم تھے، اور بائیں ہاتھ میں ایک لفافہ تھا، جس میں رکمنی کے لئے ایک ساری تھی۔

"بھائی، تیرے لئے ساری لائی ہوں۔"

رکمنی کچھ نہ بولی۔

"دیکھ تو سہی۔ پہنے گی تو پری لگے گی۔"

مجھے رام کرنے کا اچھا طریقہ ہے، مگر میں اس کے جھانسے میں نہیں آؤں گی۔ رکمنی نے سوچا۔

"پہلے کھانا کھالو، پھر ساری دیکھ لوں گی۔" رکمنی ذرا کرخت لہجے میں بولی۔

رکمنی نے کچھ اس انداز سے کھانا پروسا، جیسے وہ کھانا نہیں تھا، زہر دے رہی تھی۔ صاف ظاہر ہے کہ ہم دونوں نے زہر کھا لیا، اور ایک دوسرے سے بات چیت کئے بغیر سو گئے۔

صبح ہوتے ہی جب میری بیوی رسوئی میں جا کر چائے بنانے لگی تو اوشا میرے نزدیک آ کر بیٹھ گئی۔

"حضور، آپ اس کُرسی پر تشریف رکھیے، ذرا مجھ سے دور۔"

"کیوں جی کیا بات ہے!؟"

"اس فلیٹ میں رہنا چاہتی ہو؟"

"کیوں نہیں؟"

"پاسپورٹ بنوانا چاہتی ہو؟

"اسی کام کے لئے تو آئی ہوں۔"

"لندن جانا چاہتی ہو؟"

"کیوں نہیں؟"

"جانتی ہو لوگ تمھیں کیا سمجھتے ہیں؟"

"کیا کہتے ہیں؟"

"کہتے ہیں، تم چھنال ہو۔ بداخلاق ہو۔ مجھ سے عشق کرتی ہو۔"

"یہ بلڈنگ ہے یا پاگلوں کا ہسپتال؟" اور پھر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"تمھارے ہنسنے سے یہ مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ اوشا، لوگوں کو تمھارا چلن پسند نہیں، تمھاری لپ اسٹک سے نفرت ہے۔ تمھارے بلاؤز، تمھاری پینٹ، سے نفرت ہے۔ تم جو دوسروں سے ہنس کر، اور مُسکرا کر بات کرتی ہو، اس سے عورتیں جلتی ہیں، ان کی نیندیں حرام ہوگئی ہیں، دن رات میری بیوی کو بھڑکاتی ہیں۔"

"تو پھر میں کیا کروں؟"

"تم اپنے آپ کو بدلو۔"

"یہ نہیں ہوگا رمیش! میں اپنے آپ کو بدلنے کے لئے تیار ہوں، اگر میں غلطی

پر ہوں۔"

میں اوشا ورما سے کیا کہتا جس کی میں عزت کرتا تھا۔ مجھے تو اس میں کوئی خامی نظر نہ آتی تھی جس کی طرف اشارہ کر سکتا۔ میں بھی وقت کا انتظار کرنے لگا اور اپنی قسمت کو وقتِ رواں کے حوالے کر دیا۔ واقعات اور حالات جس طرف لے جانا چاہیں گے لے جائیں گے۔ میرے بس میں کچھ نہیں۔

دو دن کے بعد ہماری بلڈنگ کے سامنے والی سڑک سے میونسپل کمیٹی کے کچھ کارکنوں نے ایک کتے کو پکڑ کر لاری میں رکھ لیا۔ بچوں نے شور مچایا۔ محلّے کی سب عورتیں باہر نکل آئیں۔ کمیٹی کے کارکنوں کے سامنے گڑگڑائیں، ان کی منتیں کیں۔ کارکنوں نے صرف یہ کہا:

"دراصل ہمیں تو آوارہ کتوں کو گولی مارنے کا حکم ہے۔ اگر یہ پالتو کُتا ہے تو اس کا پٹہ کہاں ہے؟"

عورتیں اور بچے میونسپل ورکروں کے پیچھے پڑے ہوئے تھے کہ ہمارے محلّے کا کُتا ہے اسے چھوڑ دو!

"اس کا پٹہ کہاں ہے؟" ایک کارکن چلّایا۔ پٹہ تو کُتے کے گلے میں نہ تھا

"اس کُتے کے مالک کو تھانے بھیج دو! وہیں فیصلہ ہوگا۔"

سب لوگ کام کاج پر لگے ہوئے تھے۔ عورتوں میں تو اتنی ہمت نہ تھی کہ سرکاری وین میں بیٹھ کر کُتے کو واپس لے آئیں۔ اس وقت اوشا ورما نے ہمت کی اور وین میں بیٹھ گئی۔ اور ایک گھنٹے کے بعد کتے سمیت واپس لوٹی اور کتے کو مالکن کے حوالے کر دیا اور اس کے ہاتھ میں ایک کُتے کا پٹہ دیا اور ایک رسید۔

بچّے تو بے حد خوش ہوئے، مگر عورتوں نے ناک بھویں چڑھائیں۔ ایسی عورت جو مردوں کا مقابلہ کرے، انھیں قطعی ناپسند تھی۔ وہ اس محلّے کو ناپاک نہیں

ہونے دیں گی۔ بھلا اس کی موجودگی سے بچوں پر کیا اثر پڑے گا۔ دو دن کے لئے کیا آئی، کر ڈیڑھ مہینے سے یہیں پڑی ہوئی ہے۔ جانے کا نام نہیں لیتی۔ محلّے میں انھیں عورتوں نے سب کو بُلا کر کمیٹی کی اور رکمنی کو آڑے ہاتھوں لے لیا۔

"اری تو سمجھ دار ہوتی تو نوبت یہاں تک نہ آتی۔"

"بہن میں کیا کروں؟"

"ارے اس کی چوٹی پکڑ کر گھر سے باہر کر دے۔"

"کس بات پر اسے گھر سے باہر کر دوں راج کی ماں؟"

"اب باتیں بھی ہمیں بتائیں؟ کیا تیری آنکھوں پر پٹی بندھی ہے۔ جب سر سے پلّو ڈھلک جائے گا تب تمھیں ہوش آئے گا! تمھاری نرم پالیسی کی وجہ سے ہمارے خاوندوں کے مُنہ میں پانی آنے لگا ہے۔"

"تم نہیں جانتیں، جدھر وہ جاتی ہے، سب کی نگاہیں اس طرف جاتی ہیں۔"

"کل میرا پتی مجھ سے کہہ رہا تھا، تم بھی پینٹ پہنا کرو!"

"لو، سُن لو رکمنی! جب وہ دوکان سے آئے تو آتے ہی کہنے لگے۔ سمن کی ماں، بازار کپڑوں سے بھرا پڑا ہے، کوئی اچھے سے کپڑے خرید لا۔ کسی اچھے سے درزی سے سِلا اور انھیں سلیقے سے پہن۔ دیکھتی نہیں رکمنی کے گھر میں جو عورت آئی ہے کیا جَل پَری سی رہتی ہے۔"

"اور میرے خاوند رات کو مجھ سے کہہ رہے تھے، بال کٹوالے، اور "ناگن کی طرح بل کھا کر میری طرف دیکھ!" دیکھتی نہیں رکمنی کے گھر جو عورت ......"

"اس عورت نے تو ہمارا جینا حرام کر دیا ہے، یہ عورت نہ آتی تو مزے سے گذر رہی تھی۔ ایک تو مردوں کے لئے کھانا پکاؤ، دن رات محنت کرو۔ ان کے بچوں کو پالو۔ اب بَن ٹھَن کر ان کا انتظار کرو۔ ہونٹوں پر لپ اسٹک لگاؤ۔ مٹک مٹک کر

چلو۔ پینٹ پہنو! ہنس ہنس کر بات کرو۔ ہم گھر کی عورتیں ہیں کہ رنڈیاں؟۔ دیکھ بہن! اب بھی وقت ہے، ذرا سنبھل کر چل، ورنہ بنا بنایا گھر اُجڑ جائے گا۔ گھر آباد کرنے میں بڑا وقت لگتا ہے۔ مگر برباد ہونے میں دیر نہیں لگتی ۔"

بس، جتنے منُھ، اتنی باتیں۔ سب کا غم و غصہ اوشا ورما پر نکلا۔ کمیٹی میں بیٹھ کر سب عورتوں نے اوشا ورما کو وہ صلواتیں سُنائیں کہ خدا بھی سُنتا تو پناہ مانگتا۔ کمیٹی سے ابھی فرصت ہی ملی تھی کہ اچانک ایک لڑکی دوڑتی ہوئی آئی۔

"ہائے رام! کندن لعل تو بیہوش ہو گیا ماں جی ۔"

سب عورتیں لڑکی کے پیچھے بھاگیں۔ کمرے میں جا کر دیکھا تو کندن بے ہوش پڑا تھا۔ آنکھیں چڑھی ہوئی اور سانس بڑی مشکل سے آ رہا تھا۔ لب بھینچے ہوئے تھے، اور ہاتھ پاؤں میں تشنج تھا۔ دن کے تین بج چکے تھے۔ مرد اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے اس وقت اوشا ورما کو کسی نے آ کر اطلاع دی کہ ایک لڑکا بے ہوش ہو گیا ہے، وہ لڑکے کو دیکھنے کے لئے گھر میں داخل ہوئی پہلے تو سب نے ناک منُھ چڑھایا۔ جب دیکھا کہ یہ کام ان کے بس کا نہیں، تو سب خاموش ہو گئیں۔

اوشا نے ایک لڑکی سے پوچھا:۔

"یہاں قریب میں کوئی ڈاکٹر ہے"؟

"ہے دیدی!"

"مجھے ان کے پاس لے چلو"

"اوشا ورما اور وہ چھوٹی لڑکی ڈاکٹر کے پاس پہنچیں۔ ڈاکٹر کو جگایا۔ ٹیکسی کی اور کندن کو دکھایا۔ ڈاکٹر نے دوا دی۔ اوشا نے پھر ٹیکسی کی۔ دوا لائی، اور کندن کو دوا پلائی۔ دوا سے کندن کو کچھ فائدہ نہ ہوا۔ اوشا پھر ڈاکٹر کے پاس گئی۔ ڈاکٹر نے پھر دوسری دوا دی۔ اوشا دوپہر کے دو بجے سے لے کر صبح چار بجے تک اسی کے سرہانے بیٹھی رہی۔ عورتیں

آتیں، لڑکے کے متعلق پوچھتیں اور چلی جاتیں۔ صرف ایک اوشا ہی تھی جس نے ڈاکٹر کے کہنے کے مطابق اس لڑکے کی دیکھ بھال کی۔ صبح ۵ بجے کے قریب کندن نے آنکھیں کھولیں اور کہنے لگا "ماں!"

کندن کی ماں دوڑتی ہوئی آئی اور بیٹے کے سرہانے بیٹھ گئی۔ اوسا اُٹھنے لگی۔ نہیں بہن تو بیٹھی رہ اصل تو تو اس کی اصلی ماں ہے۔

"نہیں ماں جی' ایسی بھی کیا بات ہے۔ سیوا کرنا تو انسان کا فرض ہوتا ہے۔"

"لیکن بہن ہمارا بھی کچھ فرض ہے، ہم تمھارے متعلق نہ جانے ......" وہ خاموش ہوگئی اور مُنہ پھیر لیا۔

کندن کی ماں نے محلّے کی عورت سے یہ بات کہی۔ کندن کی بیماری کا قصہ بڑھا چڑھا کر سُنایا۔ اوشا کی بے لوث خدمت کا ذکر کیا۔

پندرہ دن کے بعد اوشا کو پاسپورٹ مل گیا۔ جب وہ ٹیکسی میں بیٹھنے لگی تو ٹیکسی کے چاروں طرف عورتیں کھڑی تھیں۔ سب کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ جیسے یہ آنسو کہہ رہے تھے:

"اوشا، تو چھنال نہیں .... تُو تو دیوی ہے —— دیوی —!"

تین تصویریں

جب ذہن میں ماضی کی تصویریں گھومنے لگتی ہیں، تو سب سے پہلے میرے ذہن کے پردے پر شرمیلا کی تصویر اُبھرتی ہے۔ تیرہ برس کی ہوگی شرمیلا اس وقت۔ جب میں نے اسے پہلی بار دیکھا — لانبا قد۔ پتلا چھریرا بدن۔ بڑی بڑی شرمیلی آنکھیں گھنے گھنے سے ابرو۔ لمبوترہ چہرہ۔ لمبی تیکھی ناک۔ گوری رنگت۔ پتلے پتلے سُرخ سے ہونٹ۔ کالے سیاہ بال جو کمر تک لٹکتے رہتے۔ جب کبھی وہ مجھ سے بات کرنے کی کوشش کرتی۔ تو آواز گلے میں اٹک جاتی۔ پیشانی پر پسینہ آجاتا۔ اس کی حرکتوں سے مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ اس نے اس چھوٹی سی عمر میں میری ذات کے متعلق بڑے حسین اور رومانی خوابوں کا جال سا بن لیا تھا۔

دراصل اس چھوٹی سی عمر میں اتنی جلدی رومانٹک ہوجانا، ایک اچنبھے کی بات ہے۔ ہوسکتا ہے اس میں دلفریب ماحول اور قدرتی مناظر کی دل کشی کا دخل ہو۔ اس چھوٹے سے شہر کے چاروں طرف گرانڈیل پہاڑ تھے، اور پہاڑوں پر گھنے گھنے جنگل آباد تھے۔ جب بہار آتی تو برفانی ہواؤں میں جنگلی پھولوں کی مہک رچی بسی ہوتی۔ پہاڑوں کی چوٹیوں پر جب برف پگھلنے لگتی تو دریا کا پانی زیادہ نیلا اور گہرا ہوجاتا۔ صحن میں نیچے

تارے کے پھول مُسکرا مُسکرا کر دیکھتے ـــــ اور سورج کی کرنیں آہستہ آہستہ جسم میں سرایت کرتیں ـــــ اور ان کی ہلکی ہلکی سی گرمی خون میں ایک نشہ سا طاری کر دیتی۔ شرمیلا اور میری محبّت کا آغاز اسی رومانی ماحول میں ہوا۔ بڑی ہی معصوم۔ پاک، اور مقدس محبت تھی۔ ایک دوسرے سے دور رہ کر بھی دل کی دھڑکنیں تیز ہو جاتیں۔ اب جب شرمیلا میرے قریب سے گزرتی، تو میرا دل برق رفتاری سے دھڑکنے لگتا۔ ہم دونوں میں اتنی جرأت نہ تھی کہ ہم ایک دوسرے سے اس پاک، اور مقدس محبت کا اظہار کرتے۔

نہ جانے کیا ہوا ـــــ ہماری محبت ادھوری ہی رہی۔

تین سال کے بعد شرمیلا بیاہی گئی۔ جب دُلہن بن کر اس شہر سے وداع ہونے لگی تو میرے سینے میں ایک ٹیس سی اُٹھی۔ ایک ناقابلِ بیان درد۔ ایک تنہائی کا احساس جس کی وجہ سے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے، میں نے یوں سوچا کہ شاید اب میں زندہ نہیں رہوں گا۔

لیکن دن گزرتے گئے۔ میں نہ مرا۔ شرمیلا بھی نہ مری۔ شرمیلا کے حسن وجمال کی اوّلین تصویر کو بھلا نہ سکا۔ وہ میرے ذہن کے چوکھٹے پر یوں مرتسم ہو گئی جیسے کوئی نگینہ انگوٹھی فٹ ہو جاتا ہے۔ میں نے سوچا۔ شاید شرمیلا نے مجھے بھلا دیا۔ اور اسے بھول جانا بھی چاہیئے۔ وہ کسی دوسرے کی ہو گئی۔ ایک دوسرے مرد کی بیوی ـــــ زندگی میں اسی طرح ہوتا ہے، اسی طرح ہوتا رہے گا۔

میں نوجوانی کی حدوں سے نکل کر آگے بڑھ گیا۔ زندگی کے نشیب و فراز دیکھے۔ زندگی نے بہت کچھ سکھایا۔ بہت کچھ بھول بھی گیا۔ لیکن شرمیلا کی اوّلین تصویر ذہن کے پردے پر اُجاگر ہوتی رہی ـــــ اس شاداب اور سرسبز پہاڑی علاقے سے نکل کر بمبئی آ گیا۔ یہیں کی مٹی راس آئی پھیلا ہوا سمندر، ہوا میں جھومتے ہوئے ناریل کے درخت نیلا آسمان اور پھر برسات کا موسم۔ جب بارش ایک طوفان کی طرح آتی اور اس گنجان اور

پھیلے ہوئے شہر کو، چاروں طرف سے گھیر لیتی ـــــ بارش کے لاکھوں کروڑوں قطرے اس دھرتی کو سیراب کرتے ـــــ اسی موسم میں ایک دن شرمیلا آئی ـــــ

بیس برسوں کے بعد ـــــ شرمیلا کو دیکھ رہا تھا۔ وہی تیلی چھریری لڑکی۔ اب ماں بن چکی تھی۔ بڑی بڑی شرمیلی آنکھوں میں اب بے باکی، اور خود اعتمادی کی جھلک نمایاں تھی۔ چہرے کے خطوط میں نرمی اور شگفتگی نہ رہی تھی۔ جسم پر گوشت کی تہہ چڑھ آئی۔ کمر ذرا پھیل سی گئی۔ کولھوں کو گولائیاں اور نمایاں ہو گئیں ـــــ کالے بالوں میں سفید بالوں کی ایک لٹ چمک رہی تھی۔ یوں کوئی ایسی تصویر نہ تھی، جو دل کو اچھی نہ لگتی ـــــ لڑکی سے ماں بن کر بھی شرمیلا کے حسن و شباب میں اضافہ ہوا تھا۔

"بھول تو نہیں گئے مجھے۔؟" شرمیلا نے مُسکراتے ہوئے کہا۔

"تمھیں بھُولنا آسان نہیں شرمیلا ...... پہلے یہ بتاؤ گھر کا پتہ کس سے پُوچھا؟"

"دل ملنے کو چاہے تو انسان کیا نہیں کر سکتا۔ بیٹھنے کے لئے بھی نہیں کہتے۔"

"تیرا گھر ہے شرمیلا۔"

شرمیلا ایک میلے صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس کا سانس تیزی سے چل رہا تھا۔ پتلے سے ہونٹوں پر ہلکی سی لپ سٹک نمایاں تھی۔ رخساروں پر ہلکا سا غازہ تھا۔ آنکھوں میں کاجل کی ہلکی سی لکیر۔ لبوں کے کونے جذبات سے مغلوب ہو کر کانپ رہے تھے۔ یوں معلوم ہوتا تھا دوسری تصویر پہلی تصویر سے مختلف تو ضرور تھی۔ لیکن بنیادی طور پر دونوں تصویریں ایک سی تھیں۔

"میں تمھیں بھلا نہ سکی۔" ـــــ اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

"شادی کے بعد بھی۔؟"

"ہاں ـــــ" شرمیلا نے اپنے جُرم کا اقبال کرتے ہوئے کہا۔

"کتنے بچے ہیں تیرے؟"

"صرف ایک لڑکی۔"

"وہ تو اب جوان ہو گی؟"

"ہاں۔ ایک دو سال میں اس کی شادی کر دوں گی۔ تُم کیا کرتے ہو؟" شرمیلا نے پوچھا۔

جو دُنیا والے کرتے ہیں ـــ یعنی کام کر کے پیٹ بھرتا ہوں۔"

"شادی کی؟"

"نہیں۔"

"کیا میں بہت یاد آئی۔ شاید بھلا نہیں سکے مجھے ـــ" شرمیلا نے بڑے یقین کے ساتھ یہ الفاظ کہے۔

"ہاں شرمیلا کافی کوشش کی تمہیں بھلانے کی۔ مگر اس کوشش میں کامیاب نہ ہو سکا۔"

یہ سُن کر اس کی باچھیں کھل گئیں۔ ایک عجیب سی چمک پیدا ہوئی رخساروں پر سُرخی کی لہر دوڑ گئی۔ کانوں کے آویزے اس کی گوری گوری گردن پر لرزنے لگے۔ سانس کی رفتار اور تیز ہو گئی۔

"تم پہلے سے دُبلے ہو گئے۔" شرمیلا نے مجھے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"بیس برس کا عرصہ کم نہیں ہوتا شرمیلا ـــ! کیا یہ معجزہ نہیں کہ میں ابھی تک زندہ ہوں!"

"چلو گھومنے چلیں۔"

میں شرمیلا کو بمبئی دکھانے لے گیا ـــ سمندر۔ ہیننگ گارڈن۔ گیٹ وے آف انڈیا۔ ایرے کالونی۔ نیشنل پارک۔ سب جگہ گئے۔ نیشنل پارک کے ایک چھوٹے سے باغیچے میں وہ لیٹ گئی۔ چاروں طرف پھول کھلے ہوئے تھے۔ نیچے ہری ہری گھاس تھی

اور اوپر مہربان اور شفیق آسمان تھا۔ نہ جانے شرمیلا کی سانس کیوں پھولی ہوئی تھی۔ رخسار کیوں دہک رہے تھے۔ آنکھیں کیوں چمک رہی تھیں۔ ناک کے نتھنے کیوں پھڑک رہے تھے، جیسے وہ کچھ کہنا چاہتی تھی۔

"شادی تو میں نے کرلی، مگر تمہیں نہ بھول سکی! ایسا کیوں ہوا؟ میرے پتی اچھے خاصے ہیں۔ دیکھنے میں خوش شکل ہیں۔ مجھے کسی قسم کی تکلیف نہیں دیتے ——— روپوں پیسوں کی کمی نہیں۔ پھر بھی جیون میں ایک خلا سا ہے ——— سب کچھ ملنے کے بعد بھی کسی بات کی کمی رہ گئی ہے۔" وہ میری طرف دیکھنے لگی۔ اس کے ہونٹ کانپنے لگے۔

"چلو شام ہو رہی ہے۔" میں نے کہا

وہ بڑی مشکل سے اُٹھی۔ جیسے اس کا اُٹھنے کو جی نہ چاہتا تھا۔

"کل میں جا رہی ہوں۔ مجھے اسٹیشن پر ملنا۔" شرمیلا نے کہا۔

اگلے دن شرمیلا سے اسٹیشن پر ملنے چلا گیا ——— وہ کمپارٹمنٹ کے دروازے پر کھڑی میرا انتظار کر رہی تھی۔ چہرے پر ایک عجیب سی اُداسی تھی۔

"چلو نا میرے ساتھ۔"

"پہلے کیوں نہیں کہا۔"

بڑی حسرت بھری نگاہوں سے اس نے میری طرف دیکھا۔ گاڑی چلنے لگی۔ وہ دیر تک دروازے پر کھڑی رہی ——— جب میں نظروں سے اوجھل ہو گیا تو وہ اندر گئی ———

پانچ سال اور بیت گئے ——— میں ایک ضروری کام کے لئے دلی گیا۔ اور کارنٹسن ہوٹل میں ٹھہرا ——— اگلی شام فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے رسیور اُٹھایا:

"ہیلو ——— کون ——— شرمیلا!"

"جی ———" ادھر سے آواز آئی۔

"تمھیں کیسے معلوم ہوا کہ میں یہاں ٹھہرا ہوا ہوں؟۔"

"کل ہی تمھارے ایک دوست سے ملاقات ہوئی۔ اس نے تمھارے ہوٹل کا ایڈریس دیا۔

"کیسی ہو؟"

"بڑے مزے میں ہوں۔ اپنی سُنائیے۔"

"بس، دن کاٹ رہا ہوں شرمیلا ـــــ میں نے بڑے اداس لہجے میں جواب دیا۔

"ارے آپ کو معلوم نہیں؟"

"کیا؟"

"میرے پتی کو مرے دو سال ہو گئے۔"

"ارے یہ کیا کہہ رہی ہو تم ـــــ؟ مجھے بے حد افسوس ہے ـــــ تمھاری بیٹی کیسی ہے؟"

"اس کی تو شادی کر دی۔"

"بہت خوب، اب تم پر کوئی بوجھ نہ رہا نا؟"

"میں نے کوٹھی بنوالی!"

"ارے واہ: مُبارک باد قبول کرو۔ ہماری طرف سے معلوم ہوتا ہے، تمھارے پتی اچھی خاصی رقم چھوڑ کر مرے ہیں؟"

"بس گزارہ ہو جاتا ہے۔ کیا کر رہے ہو، اس وقت؟"

"کچھ نہیں؟"

"آؤ نا؟"

"کہاں؟"

"میری کوٹھی پر۔"

"کہاں ہے تمھاری کوٹھی؟"

"رادھا نگر۔۔ رادھا گنج نمبر 22

"کس وقت آؤں؟"

"ابھی آؤ نا۔"

"آتا ہوں۔"

ریسیور رکھ کر میں غسل خانے میں چلا گیا۔ جلدی سے نہا دھوکر کپڑے پہن لئے۔ پھر ٹیکسی کر کے رادھا نگر کی طرف روانہ ہو گیا۔

ڈرائیور سمجھدار تھا، عین جائے رہائش پر پہنچا دیا۔۔۔ ٹیکسی سے اترا تو بنگلے کے قریب ہی شرمیلا کھڑی تھی میں نے سوچا تھا کہ کافی غم زدہ اور غمگین ہوگی شرمیلا۔ مگر وہ بے حد خوش نظر آ رہی تھی۔ اس نے مُسکراتے ہوئے میرا سواگت کیا۔۔۔ میں اس کی طرف دیکھتا ہی رہ گیا۔۔۔ سرمئی رنگ کی ساڑھی میں وہ ملبوس نظر آئی۔۔۔ پہلے سے زیادہ صحت مند ہو گئی تھی۔ جسم کے خطوط زیادہ دلکش اور دلنشین ہو گئے تھے۔۔۔ آنکھوں میں کاجل اور گہرا ہو گیا۔ رُخساروں پر غازے کی تہہ جمی ہوئی تھی، اور بالوں کو خضاب سے سیاہ کر لیا تھا۔ کانوں میں کبوتر کی آنکھوں کی طرح سُرخ سُرخ یاقوت کے جھلملاتے ہوئے آویزے لٹک رہے تھے، اور گلے میں سونے کا پُرانا اور کلاسکی طرز کا گلوبند چمک رہا تھا۔ سامنے کی دیوار پر شرمیلا اور اس کے پتی کی تصویر ٹنگی ہوئی تھی۔

"یہ رہی، میری لڑکی کی تصویر۔"

"اس کے ساتھ کون ہے؟"

"میری لڑکی کا شوہر۔۔۔ اور کون ہو سکتا ہے۔۔۔؟ ہاں تو میرا داماد کہتا ہے کہ ماں بیٹی سے زیادہ خوبصورت ہے۔"

"کیا شک ہے اس میں ـــــ تم نے بالوں کو کالا کر کے اپنے آپ کو کافر ادا حسینہ بنا لیا ہے۔"

"سچ!"

"اور مجھے جھوٹ بول کر کیا ملے گا؟"

"ابھی تک تمہاری یہی رائے ہے ـــ؟" وہ خوش ہو کر بولی۔

"ہم تو تمہارے پرانے پرستاروں میں سے ہیں شرمیلا۔ اولڈ از گولڈ ـــ!"

خوب زور سے ہنسی شرمیلا ـــ "کیا پیو گے؟"

"جو تم پلادو!"

"کوکو کولا۔ یا چائے؟"

"گرم گرم چائے پلواؤ۔"

شرمیلا نے نوکرانی کو آواز دی ـــــ نوکرانی آئی اسے چائے بنانے کا حکم دیا گیا۔

"کیا کرتے ہو؟"

"بڑے ہی بے ہنگم کام۔ یعنی ناول اور کہانیاں لکھتا ہوں، اور کبھی کبھی کسی فلم کے ڈائیلاگ بھی!"

"کتنا کماتے ہو۔؟"

"یہی کوئی ڈیرھ دو ہزار۔" میں نے رعب ڈالتے ہوئے کہا۔

رقم سن کر شرمیلا چونکی۔ چہرے پر مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ حالاں کہ میں نے جھوٹ بولا تھا۔

"امیر ہو گئے ہو نا؟"

"تم سے ذرا کم ہی امیر ہوں۔ تمہاری کوٹھی ڈیڑھ لاکھ کی ہو گی۔"

"مہنگائی کا زمانہ ہے۔ کمانے والا کوئی نہیں۔ اسی لئے نصف کوٹھی کرائے پر

دے دی ہے۔ کُل پانچ سو روپے ماہوار کرایا آتا ہے۔ بڑی مشکل سے گزارہ ہوتا ہے۔ کوٹھی کو دوبارہ روغن کرانا ہے۔ باہر برآمدے میں سنگِ مرمر لگوانا چاہتی ہوں۔"

"تاج محل بنوانے کا ارادہ ہے کیا۔؟"

"نہیں تو، غریب کی جھونپڑی ہے۔"

"تمھاری جیسی دو چار اور غریب عورتیں ہندوستان میں ہو جائیں، تو شاید اس دیش کی قسمت بدل جائے۔"

"کرلو مذاق ـــــ بڑی مشکل سے دو وقت کا کھانا نصیب ہوتا ہے۔ کمانے والا کوئی نہیں ـــــ"

اتنے میں چائے آگئی۔

"کتنے دن رہو گے یہاں؟"

"ایک، دو دن میری جان ـــــ" میں نے جان بوجھ کر پُرانی محبت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یہ الفاظ کہے۔

"میری جان"۔ سُن کر وہ ہنس پڑی۔ اسے یہ اندازِ گفتگو پسند آیا۔ وہ اندر والے کمرے میں گئی۔ کچھ اس انداز سے چلی جیسے وہ اپنے جسم کی نمائش کر رہی ہو۔ آج شرمیلا کا سلگتا ہوا حسن۔ اس کی نگاہوں کا بے باک لہجہ اور اس کے جسم کے چنچل خم بیحد خطرناک دکھائی دیے۔

"اس نے پیچھے مُڑ کر کہا ـــ کیا دیکھ رہے ہو؟"

"تمھیں!"

"جی نہیں بھرا؟"

"مرتے دم تک نہیں بھرے گا۔"

"بڑے خطرناک وچار ہیں تیرے۔" اس نے واپس آکر کہا۔ اور میرے ہاتھ

میں اپنی پہلی تصویر دیدی "پہچانو اسے۔"

"یہ تصویر تو میرے دل پر کھنچی ہوئی ہے شرمیلا۔ دکھانے سے کیا فائدہ؟"

"تم مجھے اپنا نہ بنا سکے ـــــ میں نے بہت انتظار کیا تمہارا!"

"تم نے شادی کر کے انتظار کیا۔ ہماری قربانی کی داد نہیں دیتی کہ ساری عمر تمہارے انتظار میں کاٹ دی بغیر شادی کے۔" میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"کوئی دیکھ لے گا۔ دروازہ کھلا ہے۔"

"اب کون دیکھے گا۔ دیکھنے والا تو اس دُنیا میں رہا ہی نہیں۔" میں نے اس کے شوہر کی تصویر کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"میری بیٹی آنے والی ہے۔ وقت نہیں گزرتا ـــــ دن تو کاٹ لیتی ہوں راتیں بڑی لمبی اور ڈراؤنی ہوتی ہیں۔ خاص کر سردیوں کی راتیں ـــ کتنا بینک بیلنس ہے تمہارا؟" اس نے بسکٹوں کا پیکٹ بڑھاتے ہوئے کہا۔

"یہی بیس، تیس ہزار ـــ" میں نے پھر جھوٹ بولا۔ حالانکہ بنک میں صرف دو سو روپے تھے۔

سُن کر وہ چپ ہوگئی۔

میں اُٹھا۔ اور جہاں وہ بیٹھی تھی اس کے قریب بیٹھ گیا۔ شرمیلا اُٹھ کر دروازے کی طرف چلی گئی۔

"پہلے تم میرے قریب آتی تھیں۔ تو میں دور رہتا تھا۔ اب میں قریب آتا ہوں تو تم دور رہتی ہو۔"

"کوئی دیکھ لے گا نا۔ کسی دن ہوٹل میں چلیں گے۔"

یہ فقرہ سُنتے ہی میں سن سا ہوگیا۔ کاٹو تو لہو نہیں بدن میں۔

"چپ کیوں ہوگئے۔؟"

"کچھ نہیں۔"

"ایک بات کہوں۔"

"کہونا۔"

"بمبئی پہنچ کر پانچسو روپیہ بذریعہ تار منی آرڈر بھجوا دینا۔ آج کل میرا ہات تنگ ہے۔"

میں اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"بھیجو گے نا؟"

"ہاں بھیجدوں گا۔"

میں شرمیلا کی طرف غور سے دیکھنے لگا۔ میرے ذہن میں اولین تصویر اُبھری۔ بے حد پاک۔ نیک۔ بے داغ اور معصوم سا چہرہ۔ نہ آنکھوں میں کاجل کی لکیر۔ نہ ہونٹوں پر لپ اسٹک۔ نہ رخساروں پر غازہ۔ بڑا ہی معصوم اور مقدس چہرہ تھا۔

پھر دوسری تصویر اُبھری۔ لبوں پر ہلکی سی لپ اسٹک۔ رخساروں پر ہلکا سا غازہ، جسم بھرا ہوا۔ نگاہوں میں جلن تپش اور تشنگی ملی اور کچلی ہوئی امنگوں کا ایک ہجوم۔

اور پھر یہ تیسری تصویر، جس نے ان دونوں تصویروں کو گڈ مڈ کر دیا تھا۔

عجیب بھیانک اور ڈراؤنا سا چہرہ نظر آیا مجھے۔ لبوں پر گہری لپ اسٹک۔ آنکھوں سے کاجل نکل کر رخساروں کو چھو رہا تھا۔ رخساروں پر غازہ ضرورت سے زیادہ تھا۔ بالوں میں خضاب اور ابرو کٹار کی طرح نوکیلے اور تیز تھے۔ ہونٹوں پر معصوم مسکراہٹ کی جگہ گناہ اور داستا کا اظہار تھا۔ ہوٹل ـــــ پانچ سو روپے۔ یہ محبت تھی۔ یا سودا۔ یہ پیار تھا یا روپے اینٹھنے کا ایک بھونڈا طریقہ۔ یہ کیسی شرمیلا تھی، جو اتنی بے شرم ہو گئی تھی۔ جب میں شرمیلا کی کوٹھی سے باہر نکلا تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں کسی طوائف کے کوٹھے سے نیچے اُترا ہوں!۔